بسم اللہ الرحمن الرحیم الصلوۃ والسلام علیک یارسول اللہ وعلیٰ اٰلک واصحابک یاحبیب اللہ

براہینِ رضوی

(زبیر علیزئی لامذہب کے جواب میں)

مسلکِ حق اہلِ سنت کی صداقت کا روشن بیان
اور لامذہبوں کے اعتراضات کے دندان شکن جوابات

ازقلم
قاری محمد ارشد مسعود اشرف چشتی رضوی
بانی و ناظم اعلیٰ دار القلم اسلامک سنٹر پاکستان

ناشر: فیضانِ مدینہ
پبلی کیشنز جامع مسجد عمر روڈ کامونکی ضلع گوجرانوالہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم   الصلوٰۃ والسلام علیک یارسول اللہ وعلیٰ اٰلک واصحابک یاحبیب اللہ

میثم قادری

براہینِ رضوی

(زبیر علیزئی لامذہب کے جواب میں)

مسلکِ حق اہلِ سنت کی صداقت کا روشن بیان

اور لامذہبوں کے اعتراضات کے دندان شکن جوابات

ازقلم

قاری محمد ارشد مسعود اشرف چشتی رضوی

بانی و ناظم اعلیٰ دار القلم اسلامک سنٹر پاکستان

ناشر: فیضانِ مدینہ

پبلی کیشنز جامع مسجد عمر روڈ کاموںکی ضلع گوجرانوالہ

جملہ حقوق محفوظ ھیں

نام کتاب ---------- **براھین رضوی**

ازقلم ---------- قاری محمد ارشد مسعود اشرف چشتی رضوی

صفحات ---------- 128

سن اشاعت ---------- صفر المظفر ۱۴۳۲ھ جنوری 2011ء

ہدیہ ---------- 80 روپے

الناشر:

فیضان مدینہ پبلی کیشنز جامع مسجد عمر روڈ کامونکی ضلع گوجرانوالہ

فہرست کتب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على رسوله الكريم الأمين، أما بعد :

۱۰ شوال ۱۴۳۱ھ بمطابق ۱۱ ستمبر ۲۰۱۰ء کو بعض ناعاقبت اندیش لوگوں میں سے ایک دُشنام طراز نے اپنے ماہانہ رسالہ ''الحدیث'' حضرو، شمارہ نمبر ۸۷ میں ایک مضمون شائع کیا جس کا عُنوان رکھا ''عبّاس رِضوی صاحب کہاں ہیں؟ جواب دیں!'' اس میں قبلہ حضور مُفتی محمد عبّاس رضوی صاحب زاداللہ عزہ وشرفہ الی یوم المعاد کی طرف سے آج سے تقریباً ۱۳ سال قبل لامذہبوں پر کئے گئے ۱۲ سوالات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا کہ:

''عباس رضوی نامی ایک رضا خانی بریلوی نے اہلِ حدیث یعنی اہلِ سنت سے (۱۲) سوالات کئے تھے اور یہ سوالات وصول ہونے کے بعد راقم الحُروف نے ۱۳/ رمضان ۱۴۲۹ھ (۱۴/ ستمبر ۲۰۰۸ء) کو ان کے دندان شکن جوابات مع اہل حدیث (اہل سنت) کے بارہ سوالات لکھے تھے پھر یہ سوال و جواب ماہنامہ الحدیث حضرو (محرم ۱۴۳۰ھ، جنوری ۲۰۰۹ء) عدد ۵۶ میں شائع کر دیئے گئے تھے۔ اب ایک سال سے کافی زیادہ عرصہ گزرچکا ہے، مگر کہیں سے بھی عبّاس رضوی کی طرف سے ہمارے سوالات کا جواب ہمارے علم میں نہیں آیا''۔

اوّلاً: اے نَومَولُود مُفتری! محمد عبّاس رضوی صاحب کوئی مجہول شخص نہیں بلکہ ایک معروف ومشہور اہلِ سنت عالِم دین ہیں جن کے سامنے سے تُو اور تیرا مناظر طالِب۔۔۔ یُوں غائب ہوئے تھے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

ثانیًا: اے مغرورِ گوجرانوالہ! یہ آج کل اہلِ اھوا لوگوں کے سروں پر اہلِ سُنّت میں شامل ہونے کا کیوں بھُوت سوار ہو چُکا ہے؟، میرے خیال میں یہ صرف اس لئے ہے کہ تم جیسے لامذہبوں، ناعاقبت اندیشوں، نابکاروں کو یہ تو علم ہے ہی کہ اللہ والوں کی گستاخیاں اور اہل اللہ پر کذب

وافتراء باندھنے کی وجہ سے آخرت میں ہمارا کوئی حِصّہ نہیں لیکن اس دُنیا میں لوگوں کو دجل وفریب دے کر اپنے آپ کو اہلِ حق کے نام سے منسوب کرلیں، تاکہ دُنیا میں تو پردہ پڑا رہے۔
سرِ محشر جو تم اہلِ خبیثوں کی گُستاخیوں اور بے ادبیوں کی وجہ سے رُسوائی ہوگی وہ احادیث کی روشنی میں تم پر بھی آشکارا ہے۔

ثالثًا: اے مراقی! اپنے ہمنواؤں سے خبر لے لینی تھی کہ یہ سوالات کب سے ہم لامذہبوں پر قرض ہیں اور ہم میں سے کتنے ان لاجواب سوالوں کے جواب دیتے دیتے اپنے ترکش خالی کر چکے ہیں؟ اور کتنوں کی اُمیّد بر آئی ہے، جو اِن سے ٹکرا کے پاش پاش ہوئے؟ اگر تم عقل کے ناخن لیتے تو تمہیں تیرے ہمنوا ہی بتا دیتے کہ اس مُعاملہ میں ہماری اُمیّدیں اُٹھ چکی ہیں۔

رابعًا : اے غیر مُقلدین میں اجتہاد و قیاس کے مبدع! ہم نے تو تمہاری طرف سے دیے جانے والے جوابات کو کوئی اہمیت اس لئے نہ دی کہ تمہارے ہمنوا یہی تیر پہلے آزما چکے تھے اور ان کے لایعنی دلائل کی حقیقت ہم نے واضح کردی تھی، اور تیری طرف سے لکھے گئے جوابات میں بھی کوئی خاص نئی دلیل نہ تھی جس کی وجہ سے ہم نے ان کی اشاعت کے بعد ان کے تفصیلی جواب کی طرف کوئی خاص توجّہ نہ دی۔

ہاں! ہم نے ان کے ملنے کے بعد ۲۰۰۹-۰۹-۰۶ کو مختصراً ان بے سروپا اعتراضات کی حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح کر کے چند اوراق عزیزم فیصل خان کو بھجوا دیے تھے، جن کو وہ کچھ مصروفیات کی وجہ سے شائع نہ کروا سکے۔ اب وہی چند صفحات تھوڑے سے اضافہ کے بعد، جو کہ تیری طبیعت کی ناسازی کے پیشِ نظر کیا گیا ہے، مع مقدمہ، اور ''ڈھول کا پول'' جو کہ تیرے ہمنواؤں کے جواب میں شائع کیا گیا تھا، شائع کروا رہے ہیں۔
پس ہمارے سوالوں کے ہماری بیان کردہ شرائط، جو درحقیقت تمہارے بڑوں کے بیان کردہ

اُصول ہی ہیں کہ'' اہلِ حدیث کے دو اُصول کِتاب اللہ اور سُنّتِ رسُول'' کے مُطابِق جواب دو۔ ان کے مذکور شرائط کے مطابق جوابات کے بعد پھر ہم پر سوال کرو گے تو ہم ان کا جواب دیں گے، ان شاء اللہ، لیکن پہلے ہمارے اُصُول وضوابط سے بے خبری کو دُور کر لینا۔

خامسًا : دس گیارہ سال بعد تجھے جو لایعنی اور غیر متعلّق جواب دینے کا شوق چُرایا تو صرف اس لئے کہ ایسا نہ ہو کہ کہیں اپنے حواریوں میں ہی تمہاری ہوا اُکھڑ جائے، لہٰذا یہ سوچا کہ اس بارے میں کچھ ورق سیاہ کر دینے چاہئیں۔ باقی رہا یہ جوابات جن کو جناب دندان شکن جوابات کہہ رہے ہیں، یہ بات جناب کے رفیقوں میں تو تمہاری ناک اُونچی کر سکتی ہے لیکن میدانِ تحقیق میں یہ تیری ناک قلم کروانے کا باعث بننے کے علاوہ تجھے ذلیل و رُسوا کر کے چھوڑے گی، اور ان جوابات سے علیزئی کی علمی لیاقت و دیانت کا بھی بھرم کُھل گیا اور آنے والی سطور میں مزید عیاں ہو جائے گا۔

آگے لامذہب لکھتا ہے کہ: ''اگر عبّاس رضوی صاحب کسی کونے کُھدرے میں زندہ موجود ہیں تو پھر ہمت کر کے ان سوالات کے جوابات پیش کریں اور اگر وہ مر کر آنجہانی ہو چکے ہیں تو پھر نام نہاد نُوریوں اور ناریوں سے مُطالبہ ہے کہ وہ ہمارے سوالات مکمّل (بغیر کسی تبدیلی کے) نقل کر کے ان کے جوابات بھیجیں تا کہ عوام کی معلومات میں اضافہ ہو اور یہ بھی واضح ہو جائے کہ کون حق پر ہے اور کون باطل پر ہے؟ صرف سوالات کر کے بھاگ جانا مَردوں کا کام نہیں اور نہ اس میں عوام کا فائدہ ہے''۔

اولًا : الحمد للہ ! حضرت علّامہ مولانا محمد عباس رضوی صاحب مدظلہ العالی تو زندہ وحیات ہیں اور خدا تعالٰی کی توفیق کے ساتھ اتنی جُرأت وہمت رکھتے ہیں کہ تم جیسے گوجرانوالہ کے مفروروں کو، ایک گھنٹہ تو بہت زیادہ وقت ہوتا ہے اس سے بھی کم وقت میں، نہ صرف زیر کر دیتے

ہیں بلکہ اپنی خُداداد صلاحیتوں سے یُوں بچھاڑتے ہیں کہ دُم دبا کے بھاگتے ہوئے نظر بھی نہیں آتے ہو۔

ثانیا : جناب جیسے ہزاروں نام نہاد اور خُود ساختہ قسم کے فضیلۃ الشیخ ومحدث جو تارِ عنکبوت سے دیواریں کھڑی کرتے ہیں ان کو تو وہ نظر میں بھی نہیں لاتے چہ جائیکہ کہ جناب جیسے خالی خولی بڑھکیں ماریں اوران سے مُقابلہ کی سوچیں۔ باقی رہے وہ جوابات جو جناب نے ہمارے سوالات کے جواب میں دینے کی کوشش کی ہے ان کا حال ستیاناس آئندہ اوراق میں کُھل کر سامنے آرہاہے جس سے یہ واضح ہوگا کہ علیزئی نے کس طرح اپنے لامذہب گروہ کا ستیاناس کیا ہے، اوریہ بھی واضح ہوجائے گا کہ جناب ایک بھی سوال کا جواب نہیں دے سکے اور نہ ہی قیامت تک کوئی لامذہب اپنی لامذہبیت کی دلدل میں پھنسے رہ کر جواب دینے کی ہمت وجُرأت رکھتا ہے۔

ثالثًا : الحمد للہ ! نُوری تو یہ جانتے ہیں کہ لامذہب ایک بھی سوال کا جواب نہیں دے سکا، پس پہلے ہی نوریوں کا تمہارے اُوپر اور تمام دوسرے لامذہبوں پر قرض موجود ہے۔

جب پہلا قرض ادا کرلوگے تو پھر دیکھنا کہ نُوری کیسے تجھ جیسے نابکار، جاہلِ مُطلق اور تیرے ہمنوا ناریوں کو تحت الثریٰ تک پہنچاتے ہیں۔

رابعًا : ایک لامذہب وبے اُصول انسان کی باتوں میں تبدیلی کا تو وہ سوچیں جن کے پاس کوئی مذہب واصول نہ ہو، الحمدللہ ہم تو مذہب واصول والے ہیں، اپنے مذہب واصول کی پاسبانی کرنے کی خدائے بزرگ وبَرتَر نے توفیق وہمت عطا فرمائی ہے، جو کسی کے اُصول سے واقف ہی نہ ہو، اور بے بنیاد اٹکل پچو لگانے میں ہی مصروف رہتا ہو، اس کی باتوں کی طرف توجہ کرنا کوئی دانائی نہیں۔ اگر جناب کو ہمارے سوالات کے جوابات دینے کا اتنا ہی شوق ہے تو پہلے ہمارے

اُصول پڑھ، پھر ہم سے سوال کر، پھر دیکھ تجھے کیسے جواب ملتے ہیں۔ ہم نے تو تمہارے بنائے ہوئے اُصولوں کے مطابق سوالات کئے تھے جن کے جواب ابھی تک ان شرائط کے مطابق نہیں دیے جاسکے جو سوالات کے ساتھ مذکور ہیں اور قیامت تک نہیں دیے جاسکیں گے، ان شاءاللہ العزیز۔

خامسًا : ”ڈھول کا پول“ کی اشاعت کے بعد عوام کو یہ واضح ہوگیا تھا کہ لامذہب کبھی بھی اپنے قائم کردہ اُصولوں کے تحت ان سوالوں کے جوابات نہیں دے سکتے، ہاں اِدھر اُدھر کی ٹامک ٹوئیاں مارنے کے علاوہ ان کے پاس اور کوئی چارۂ کار نہیں، لیکن کیا کریں بے ہنگم وبے بنیاد شور نہ مچائیں تو بات نہیں بنتی، لہٰذا انہوں نے یہ سبق اچھی طرح یاد کرلیا ہے کہ چور مچائے شور، چور چور چور۔ یہی کام آپ جناب نے سرانجام دیا کہ کوئی جواب تو بن نہ سکا لیکن چند ورق سیاہ کرکے اپنے شور کو وہابی ریکارڈر پر ریکارڈ کروادیا۔

آگے علیزئی نے لکھا کہ: ”عباس رضوی صاحب سے مُطالبہ ہے کہ بُزدلی چھوڑ دیں، مردِ میدان بنیں اور جس طرح بیت العنکبوت میں بیٹھ کر سوالات داغے تھے، اسی طرح بیت العنکبوت میں بیٹھ کر ہمارے سوالات وصول کریں اوران کے جوابات پیش کریں“۔

اولاً : سبحان اللہ ! علیزئی صاحب ! آپ جناب جیسے جنم جنم کے ڈرپوک گیدڑ شیروں کو بہادُری وشجاعت کا درس دے رہے ہیں۔

اے مختل الحواس ! کیا گوجرانوالہ کی سرزمین سے دُم دبا کر اپنی ننھی سی جان بچانا بھول گئے کہ اب مردِ میدان بننے کی باتیں جناب کو یاد آگئیں؟۔

ثانیا : ہمارا تو پہلے بھی تمام لامذہب مُحققین اور نام نہاد خود ساختہ مُحدِّثین کو چیلنج تھا کہ کوئی لامذہب ہماری طرف سے کئے جانے والے سوالات کے عائد کردہ شرائط کے مطابق جواب دینے کے

لئے ہمارے سامنے آئے، مگر نہ جانے لامذہبوں نے کس طرح ایک بے چارے طالب۔۔شاہ
کو تیار کر کے سامنے لانے کی سعئ لاحاصل کی جو چوتھے سوال تک مقابلہ کی تاب نہ لاسکا اور
بالآخر اُس نے بھی دُم دبا کر بھاگنے میں ہی اپنی عافیت سمجھی، اور مجھے یقینِ کامل ہے کہ اس کے
بعد آج تک دوبارہ ان سوالات کے جوابات دینے کا اس نے کبھی خواب بھی نہیں دیکھا ہوگا۔ اگر
جناب میں کوئی دَم خَم اور سکت ہے تو آیئے ہم پھر دعوتِ مبارزت دیتے ہیں کہ مردِ میدان بنیں
اور عورتوں کی طرح چُھپ کر مقابلہ کی بجائے سامنے تشریف لائیں۔

ہاں! یہ ذہن نشین رہے کہ کسی ایرے غیرے سے بات نہیں ہوگی بلکہ آپ جناب جو
بزعم خویش علمی میدان کے بڑے شہسوار بنے پھرتے ہیں بات ہوگی۔ باقی سب کچھ اس کہاوت
کی طرح سمجھا جائے گا کہ ''شیر شاہ کی داڑھی بڑی یا سلیم شاہ کی؟''۔ سمجھ تو گئے ہوں گے؟۔

ثالثًا: جناب کے بقول، یہ سوالات بیت العنکبوت میں بیٹھ کر داغے گئے تھے، اس کے باوجود
یہ عالم ہے کہ ۱۲ سال میں تین نام نہاد محققین اور مناظرین نے ہمت کی لیکن انہیں بھی مُنہ کی کھانی
پڑی۔ اب آپ جناب کے سر پر وہابی بھُوت سوار ہوا ہے تو آیئے ہم آپ کو کُھلم کُھلا دعوتِ
مبارزت دینے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتے چلیں کہ اگر بیت العنکبوت میں بیٹھ کر داغے جانے
والے سُنّی میزائل اتنے تکلیف دہ اور تباہ کُن ثابت ہوئے ہیں تو جب بیت السلاح سے
داغے جائیں گے تو لامذہبیت ونجدیت کا کیا حال ہوگا۔

رابعًا: ہم ان کے علاوہ بھی ہر سوال کا جواب دینے کے لئے چشم براہ ہیں لیکن پہلے ہمارے
سوالوں کے جوابات تو دیں۔ کسی اعتراض کا صحیح جواب تو بن سکا نہیں اور آگے سے سوال کرنے
بیٹھ گئے۔ خیر ہم پھر بھی تیار ہیں لیکن جناب پہلے یہ تو تسلیم کرلیں اور اپنے رسالہ میں شائع کردیں
کہ اُن شرائط کے مطابق، جو جناب ہی کے بڑوں کے قائم کردہ اُصول ہیں، ہم ان سوالوں کے

جوابات نہیں دے سکتے، لہذا ہمارے سوالوں کے جوابات دیئے جائیں۔

خامسًا: آگے جناب علیزئی نے اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ پر ایک تہمت وافتراء لگاتے
ہوئے لکھا کہ اس کا جواب دیں، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک سال سے زائد عرصہ
گزرنے کے بعد انہیں یہ معلوم ہو چُکا ہے کہ میرے باقی سوالات تو فضول ہیں صرف یہ ایک
سوال ہے جو شاید ان کے لئے بہت بھاری ہے اور اس کا جواب نہیں بن پڑے گا۔

علیزئی صاحب نے لکھا ہے کہ: ''احمد رضا خان بریلوی نے اللہ تعالیٰ پر جھُوٹ بولا تھا، جس کا
باحوالہ ذکر اہلِ حدیث سوال نمبر ۸ میں موجود ہے' اس کا جواب دیں اور اپنے نَومَولُود رضا خانی
فرقے کے امام کو کذب وافتراء کی جرح سے بری الذمہ ثابت کرنے کی کوشش کریں۔ اگر زندہ
ہیں تو جواب دیں! (۱رشوال ۱۴۳۱ھ، ۱۱رستمبر ۲۰۱۰ء)

اوّلًا: ﴿لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكَاذِبِيْن﴾ اے کذّاب ومُفتری! کیا علیزئی صاحب جناب جانتے
نہیں کہ کسی انسان پر تہمت لگانا کتنا بڑا جُرم ہے؟۔

اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے نہ تو اللہ ربّ العزت پر کوئی جھُوٹ بولا ہے اور نہ ہی ان کا یہ بیان
کرنا ذاتی ہے، بلکہ آپ نے تو جمادات ونباتات میں اطاعت ومعصیت کے مادہ کا تذکرہ کرتے
ہوئے یہ بات بیان فرمائی ہے کہ جمادات ونباتات میں بھی معصیت کا مادہ پایا جاتا ہے، اور اس
پر آپ نے یہ واقعہ ذکر کیا ہے جو کہ نہ تو جھُوٹ ہے اور نہ ہی آپ کا ذاتی بیان، جیسا کہ آگے اس
کے بارے میں ذکر ہوگا، ان شاء اللہ العزیز۔

ثانیًا: اگر اس بات کا جواب کُتُبِ تفاسیر واحادیث اور کتبِ اسلاف سے مل جائے تو پھر اعلیٰ
حضرت رحمۃ اللہ علیہ پر تیرا افتراء ثابت ہوجائے گا، اسی لئے میں نے تیرے بارے میں کذّاب
ومُفتری کے الفاظ استعمال کئے ہیں کیوں کہ وہ بات جس کو تو اللہ عزوجل پر جھُوٹ بولنے سے تعبیر

کررہا ہے وہ احادیثِ مبارکہ میں ثابت ہے جیسا کہ آگے آرہا ہے، ان شاء اللہ العزیز۔

ثالثًا : الحمد لله ! ہم اہلِ سنت وہ ہیں جن کے بارے میں تیرے بڑے بھی لکھ گئے ہیں کہ جو جماعت رسول اللہ ﷺ کی ظاہری حیاتِ مبارکہ میں موجود تھی، اور جو صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی جماعت تھی، وہ اہلِ سنت ہی تھی۔

جیسا کہ تمہارے ہی بڑے ''صادق سیالکوٹی'' نے لکھا کہ:''ان الناس كانوا في حياة النبي ﷺ أهل السنة''. (كنز العمّال : برحاشيه مسند أحمد)۔

''بے شک لوگ رسُولُ اللہ ﷺ کی زندگی میں اہلِ سنت تھے''۔ (سبیل الرسول ﷺ صفحہ ۶۸)۔

رابعًا : نَومَولود کون ہیں؟ اس کے متعلق بھی جناب اپنے ہی بڑے کی زبانی سن لیں۔

آپ ہی کا بڑا عبدالمجید سوہدروی، محمد حسین بٹالوی کا تذکرہ کرتے ہوئے حاشیہ میں لکھتا ہے کہ:

''آپ کا وطن بٹالہ تھا۔ مگر قیام زیادہ تر لاہور ہی میں رہا پہلے بھاٹی گیٹ کی مسجد میں اقامت اختیار فرمائی، پھر چینیانوالی مسجد میں آگئے۔ لاہور میں آٹھ تراویح کی ترویج آپ ہی سے ہوئی۔ ''اشاعۃ السنۃ'' کے ذریعہ اہلحدیث کی بہت خدمت کی لفظ وہابی آپ ہی کی کوشش سے سرکاری دفاتر اور کاغذات سے منسوخ ہوا اور جماعت کو اہل حدیث کے نام سے موسوم کیا گیا۔

(سیرت ثنائی حاشیہ صفحہ ۴۵۲۔۴۵۳)

محمد حسین بٹالوی ۲۹ جنوری ۱۹۲۰ء میں اپنی موت آپ مرا اور ۸۵ سال عمر پائی۔

اس طرح ۱۸۳۵ء اس کی تاریخ پیدائش ٹھہری اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ بٹالوی نے پیدا ہوتے ہی کوششیں شروع کردی تھیں کہ وہابیوں نجدیوں کو اہلِ حدیث کا نام الاٹ ہوجائے تب بھی تمہارے اہلحدیث بننے کی عُمر زیادہ سے زیادہ پونے دو سو سال (۱۷۵) بنتی ہے۔ اب تو جناب علیزئی صاحب آپ کو علم ہوگیا ہوگا کہ نَومولود فرقہ کون سا ہے؟۔

ہاں کُتبِ احادیث وسِیَر وتاریخ میں کہیں سے بھی نکال کر اہلِ حدیث کے لفظ کو جناب اپنے اُوپر فِٹ مت کرلیا کرو کیونکہ جناب ہی کا بڑا مولوی، اسماعیل سلفی، لکھتا ہے کہ:

''وہابیوں نے بھی اہلحدیث کا مذہب ہندوستان ہی سے لیا ہے'' (الانطلاق الفکری ص ۱۱۸)۔

اس وقت ہم ان عبارات پر نہ تو تبصرہ کرتے ہیں اور نہ ہی کوئی مزید وضاحت کرتے ہیں، اگر جناب کو اور ڈوز کی ضرورت محسوس ہوئی تو پھر ان شاء اللہ پوری خوراک دے دیں گے۔

خامسًا : قارئین کرام! اب ملاحظہ ہو اس مُفتری وکذّاب کا وہ سوال جس کی اس نے بات کی ہے:''اہل حدیث کا سوال نمبر ۸: نماز کے سوالات سے ہٹ کر عرض ہے کہ احمد رضا خاں نے کہا:

''غزوہ احزاب کا واقعہ ہے رب عزوجل نے مدد فرمانی چاہی اپنے حبیب کی شمالی ہوا کو حکم ہوا جا اور کافروں کو نیست ونابود کردے۔ اس نے کہا'' الحلائل لا يخرجن بالليل'' بیبیاں رات کو باہر نہیں نکلتیں فأعقمها الله تعالى تو اللہ تعالیٰ نے اس کو بانجھ کردیا اسی وجہ سے شمالی ہوا سے کبھی پانی نہیں برستا'' (ملفوظات حصہ ۴ ص ۴۱۹ مطبوعہ حامد اینڈ کمپنی، ۳۸۔ اردو بازار لاہور)

ہوا کا اللہ کے حکم سے انکار کردینا کون سی صحیح حدیث میں لکھا ہوا ہے؟ باحوالہ اور تصحیح سند جواب دیں اور یہ مسئلہ بھی سمجھا دیں کہ اگر اللہ تعالیٰ ہوا کو حکم دے تو ہوا اس پر عمل کرنے سے انکار کردیتی ہے۔ کن فیکون کا کیا مطلب ہے؟۔

الجواب : جناب کے امام محمد بن علی بن محمد شوکانی اپنی تفسیر ''فتح القدیر'' میں ابن جریر، ابن ابو حاتم، حاکم کی الکنی، ابوالشیخ، ابن مردویہ اور ابونعیم کی دلائل النبوۃ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

عن ابن عباس قال : لما كان ليلة الأحزاب جاء ت الشمال الى الجنوب ، فقالت : انطلقي فانصري الله ورسوله ، فقالت الجنوب : ان الحرة لا تسري بالليل ، فغضب الله عليها وجعلها عقيما ، فأرسل عليهم الصبا ، فأطفأت

نیرانهم وقطعت أطنابهم فقال رسول الله ﷺ : نصرت بالصبا و أهلكت عاد بالدبور ،فذلك قوله ﴿فأرسلنا عليهم ريحا وجنودا لم تروها﴾.

(فتح القدير الجامع بين فني الرواية والدراية من علم التفسير ٢/٤٠٤)

یعنی حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے، فرمایا کہ جب غزوۂ احزاب کی رات آئی تو (ہوا) شمال کی طرف سے جنوب کی طرف چلی، پس فرمایا کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مدد کے لئے چل، تو جنوب کی (ہوا) نے کہا: گرمی رات کو نہیں چلتی، پس اللہ عزوجل اس پر ناراض ہوا اور اس کو بانجھ بنا دیا۔ پھر ان پر صبا کو بھیجا تو اس نے ان کی آگ کو بجھا دیا اور ان کے خیموں کی رسیوں کو توڑ دیا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میری صبا سے مدد کی گئی ہے، عاد کو دبور سے ہلاک کیا گیا، یہ ارشادِ خداوندی ﴿فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا وَّجُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا﴾ اسی بارے میں ہے۔

کیا جناب کے یہ امام اللہ عزوجل پر جھوٹ باندھنے والے ہیں؟۔

کیا جن کے حوالہ سے شوکانی صاحب نے بیان کیا وہ تمام بھی اللہ عزوجل پر جھوٹ باندھنے والے ہیں؟۔ کیا حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بھی اللہ عزوجل پر جھوٹ باندھنے والے ہیں؟ معاذ اللہ من ذلک۔

ہوسکتا ہے کہ آپ جناب اپنی عادت کے مطابق اپنے اس امام کو بھی اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھنے والا لکھ دیں لیکن یاد رکھنا کہ ایک یہی نہیں بلکہ ساتھ ابن کثیر بھی شامل ہیں کیونکہ انہوں نے بھی پہلے ابن جریر کے حوالہ سے اسے عکرمہ سے بیان کیا، پھر کہا کہ ابن ابو حاتم نے ''ابی سعید الاشج، عن حفص بن غیاث، عن داود، عن عکرمہ عن ابن عباس'' بھی اس کو ذکر کیا ہے۔

(تفسیر ابن کثیر ٦/٣٨٥)

اسی طرح امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عکرمہ والی روایت کو اپنی تفسیر '' معالم التنزيل ٦/٣٢١.٣٢٢ '' پر۔ امام دینوری رحمۃ اللہ علیہ نے ''المجالسة وجواهر العلم ١٩٩ (١١٤٠)'' میں۔

اسی طرح عکرمہ کی روایت کو ابن عادل حنبلی نے اپنی تفسیر '' اللباب '' ابن جریر نے اپنی تفسیر ''جامع البيان '' اور ثعلبی نے اپنی تفسیر ''الكشف والبيان '' اور محمد شربینی الخطیب نے اپنی تفسیر ''السراج المنير '' اور خازن نے اپنی تفسیر '' لباب التأويل '' میں سورت احزاب کی تفسیر میں اس روایت کو بیان اور نقل کیا ہے۔

حافظ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے '' الدر المنثور ٦/٥٧٣ '' میں اور ''الخصائص الكبرى ١/٣٨٠ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی اس روایت کو نقل کیا ہے۔

اور دوسرے کئی علماء مثل (مدارج النبوت ٢/١٧٣) شاہ عبدالحق محدث دہلوی وغیرہ نے بھی اپنی اپنی تصانیف میں اس روایت کو نقل کیا ہے۔

اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح بخاری کی شرح ''فتح الباری'' میں لکھا ہے کہ:

'' وروى ابن مردويه في التفسير من طريق أخرى عن ابن عباس أيضا : قالت الصبا للشمال : اذهبي بنا ننصر رسول الله ﷺ فقالت : ان الحرائر لا تهب بالليل ، فغضب الله عليها فجعلها عقيما .

(فتح الباری ، كتاب المغازی ٢/٧/١٨١ ،وفي نسخة ٧/٤٠٢)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اس روایت کو امام بزار نے اپنی مسند میں ایسی سند کے ساتھ، جس کے تمام راوی ثقہ ہیں، روایت کیا ہے۔

ملاحظہ ہو سند مع متن حدیث:

حدثنا عبد الله بن سعيد ،قال: حدثنا حفص بن غياث عن داود ، عن عكرمة ، عن ابن عباس رضى الله تعالى عنهما ،قال : أتت الصبا الشمال فقالت : مري حتى ننصر رسول الله ﷺ فقالت الشمال : ان الحرة لا تسري بالليل فكانت الريح التي نصر بها رسول الله ﷺ الصبا.

(مسند البزار ۲/۱۶۲ (۴۷۲۱)

اس روایت کے پہلے راوی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما ہیں جو کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابی ہونے کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ کے چچازاد بھائی بھی ہیں۔

دوسرے راوی: حضرت ابوعبداللہ،عکرمہ مولیٰ ابن عباس ہیں،جن کے بارے میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ:

"ثقة ثبت عالم بالتفسير ، لم يثبت تكذيبه عن ابن عمر ،ولا تثبت عنه بدعة ، من الثالثة ". (تقریب التهذيب ۴۳۷ (۴۶۷۳)

تیسرے راوی: ابوبکر اوابومحمد، داود بن ابی ھند القشیر ی ہیں، جن کے بارے میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ:

"ثقة متقن كان يهم بأخرة ". (تقریب التهذيب ۱۸۷ (۱۸۱۷)

چوتھے راوی: ابوعمر، حفص بن غیاث بن طلق ہیں، جن کے بارے میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ:

"ثقة فقيه تغير حفظه قليلا في الآخرة ". (تقریب التهذيب ۱۵۷ (۱۴۳۰)

پانچویں راوی: ابوسعید، عبداللہ بن سعید بن حصین ہیں، جن کے متعلق حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ: "ثقة ". (تقریب التهذيب ۳۲۰ (۳۳۵۴).

چھٹے راوی: صاحب مسند امام بزار رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔

جبکہ امام ابوالشیخ کی "العظمة ۴/۱۳۴۶ " میں ان کے متابع امام عبدالرحمٰن بن ابی حاتم، عمر بن عبداللہ اور امام ابن الجارود ہیں جبکہ امام ابن ابی الدنیا نے بھی عبداللہ بن سعید سے "المطر والرعد والبرق ۱۳۹ (۱۳۴)" میں اس کو روایت کیا ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں عبداللہ بن سعید سے "كتاب الفتن ، باب : خروج النار" میں روایت لی ہے، اور حفص بن غیاث سے تقریباً ۸۵ روایات لی ہیں، جبکہ امام مسلم نے عبداللہ بن سعید عن حفص بن غیاث کی سند سے اپنی صحیح میں "كتاب المساجد ومواضع الصلاة ،باب: من أحق بالامامة "ص ۳۱۵ (۱۵۳۷)" وغیرہ مقامات پر روایات لی ہیں، اور داود بن ابی ہند سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں تقریباً پانچ (۵) روایات، اور امام مسلم نے اپنی صحیح میں تقریباً چونتیس (۳۴) روایات بیان کی ہیں، جبکہ عکرمہ سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں تقریباً دوسوبیس (۲۲۰) اور امام مسلم نے اپنی صحیح میں دو (۲) روایات کا اخراج کیا ہے، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے تقریباً چھ سوبیس (۶۲۰) اور امام مسلم نے اپنی صحیح میں تقریباً دوسوچھتیس (۲۳۶) روایات لی ہیں۔

اسی لئے امام ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ " مجمع الزوائد "میں اس روایت کو امام بزار کے حوالہ سے نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ: "رواه البزار ورجاله رجال الصحيح ".

(مجمع الزوائد،باب نصره بالريح والرعب ، ۲/۱۲۸ (۱۰۱۵۸) وفي نسخة : ۶/۳۴ (۹۹۳۶).

اور محمد بن یوسف الصالحي الشامی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب " سبل الهدى والرشاد ۴/۳۷۶، و ۱۰/۳۱۶ " میں فرماتے ہیں کہ: " وروى ابن أبي حاتم و أبو نعيم

والبزار برجال الصحيح عن ابن عباس "اوردوسرے مقام پر "روی البزار برجال الصحیح"۔

یہی لا مذہب علیزئی کئی مقامات پر کسی راوی کی توثیق ثابت کرنے کے لئے امام ترمذی، نسائی اور ابن خزیمہ وغیرہما کی جامع، سنن یا صحیح میں بغیر کسی جرح کے بیان ہونے والی روایات کے راویوں کو اُن کے نزدیک ثقہ تسلیم کرتا اور لکھتا ہے۔

پس آیئے اس لحاظ سے اس روایت کے بارے میں کچھ تفصیل ملاحظہ فرمائیں:

عن داود بن أبي هند عن عكرمة عن ابن عباس رضى الله تعالى عنهما کی سند:

امام ترمذي رحمۃ اللہ علیہ اپنی "الجامع" میں "كتاب التفسير، سورة بني اسرائيل" صفحه ٨٧٠ (٣١٥٢)" میں اس سند سے ایک روایت بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ:

"هذا حديث حسن صحيح غريب من هذا الوجه"۔

اوراسی طرح "سورة اقرأ باسم ربك، صفحه ٩٣١ (٣٣٦٠)" کی تفسیر میں اسی سند سے ایک روایت بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ: "هذا حديث حسن غريب صحيح".

اورعبداللہ بن سعید عن حفص بن غیاث کی سند سے اپنی "الجامع" میں "كتاب الطهارة ٦٧ (١٤٦)" میں ایک روایت کے بارے میں فرمایا کہ: "هذا حديث حسن صحيح"، اور "كتاب الأحكام ٣١٩ (١٣٦٦)" میں ایک روایت کے بارے میں کہا کہ: "حديث البراء حديث حسن غريب"، اور "كتاب الأضاحي ٣٦٢ (١٥٠٠)" میں کہا کہ: "هذا حديث حسن صحيح غريب" یونہی کہیں تحسین اور کہیں تصحیح فرمائی ہے۔

اسی طرح امام ابوبکر محمد بن اسحاق بن خزیمہ نے اپنی "صحیح" میں اسی سند سے ایک روایت

"باب: اباحة الزيادة على التلبية في الموقف بعرفة بأن الخير خر الآخرة، ج٢ ص ١٣٣٥ (٢٨٣١)" میں روایت کی ہے۔

اور عبداللہ بن سعید عن حفص بن غیاث کی سند سے اپنی "صحیح" میں "باب: الزجر عن لبس الأقبية في الاحرام، ج٢ ص ١٢٣٥ (٢٥٩٨)"، اور "باب: اباحة الوقوف حيث شاء الحاج من المزدلفة اذ جميع المزدلفة موقف، ج٢ ص ١٣٤٦ (٢٨٥٨)"، اور "باب: الرخصة في النحر والذبح أين شاء المرء من منى، ج ٢ ص ١٣٥٩ (٢٨٩٠)" وغیرہم مقامات پر روایات لی ہیں۔

یونہی امام ابن حبان اپنی "صحیح" میں "كتاب الطهارة، ج٣ص ٤١١ (١١٢٩)، وكتاب النكاح، ج٩ ص ٤٣٧ (٤١٢٩) وغیرہما مقامات پر روایات لائے ہیں۔ اور دوسرے کئی مقامات پر عبداللہ بن سعید اور حفص بن غیاث کی روایات بیان کی ہیں۔

لہذا ثابت ہوا کہ علیزئی کے اصول کے مطابق اس روایت کے تمام راوی امام ترمذی، ابن خزیمہ اور ابن حبان کے نزدیک ثقہ ہیں اور ان کی یہ روایت صحیح ہے۔

امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "المستدرك على الصحيحين" میں ایک روایت مندرجہ ذیل سند کے ساتھ بیان کی: "حفص بن غياث عن داود بن أبي هند، عن عكرمة، عن ابن عباس رضى الله تعالى عنهما ... الخ. اور فرمایا کہ: "هذا حديث صحيح الاسناد ولم يخرجاه". (مستدرك ٢/٤٨٢ (٢٦٧٥)).

اور حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے "تلخیص" میں لکھا کہ "صحیح"۔

پس امام حاکم اور ذہبی کے نزدیک حفص بن غیاث سے لے کر حضرت ابن عباس تک ساری سند صحیح ہے، اور امام حاکم نے عبداللہ بن سعید کی بھی کئی روایات کی تصحیح فرمائی ہے۔

حفص بن غیاث کا آخری عمر میں تھوڑے اختلاط کا شکار ہو جانا، یہ بھی اس روایت میں نقصان دہ نہیں ہے کیونکہ اسی لامذہب علیزئی نے سماک بن حرب کے اختلاط کی بحث میں لکھا ہے کہ:

''ابن الصلاح الشہر زوری نے کہا:

"واعلم أن من كان من هذا القبيل محتجا بروايته في الصحيحين أو أحدهما فانا نعرف على الجملة أن ذلك مما تميز وكان ماخوذا عنه قبل الاختلاط والله أعلم" (علوم الحديث مع التقييد والايضاح ص ٤٦٦ نوع ٦٢)

یعنی مختلطین کی صحیحین میں بطور حجت روایات کا مطلب یہ ہے کہ وہ اختلاط سے پہلے کی ہیں، یہ قول دوسرے قرائن کی روشنی میں بالکل صحیح ہے۔ (مقالات ج ا ص ۴۳۵)

لہٰذا حفص بن غیاث کا آخری عمر میں اختلاط کا شکار ہو جانا بھی اس روایت کے لئے اسی لامذہب علیزئی کے بیان کردہ قانون کے تحت مُضر نہیں۔

جبکہ امام ابو الشیخ اپنی کتاب " العظمة " میں مندرجہ ذیل سند و متن کے ساتھ بھی اسے روایت کرتے ہیں:

" حدثنا عبد الرحمن بن الحسن حدثنا يحيى بن ورد حدثنا أبي حدثنا عدي بن الفضل عن داود عن عكرمة عن ابن عباس رضى الله تعالى عنهما قال : لما كانت ليلة الأحزاب جاء ت الشمال الى الجنوب فقالت : انطلقي فانصري الله ورسوله فقالت الجنوب : الحرة لا تسري بالليل ، فأرسل الله الصبا ، فأطفأت نيرانهم وقطعت أطنابهم فقال رسول الله ﷺ نصرت بالصبا ، وأهلكت عاد بالدبور . (العظمة ۱۳۴۸/۴ (۸۶۶۷).

اس روایت کی سند کے تمام راویوں کی توثیق کی گئی ہے، سوائے عدی بن فضل کے، اس کو امام ابن

حبان نے ثقات میں ذکر کیا ہے لیکن اکثریت نے اس کی تضعیف کی ہے۔

اور اس روایت کی شاہد وہ مرسل روایت بھی ہے، جس کو دوسرے محدثین کے علاوہ امام ابن جریر نے اپنی تفسیر میں حضرت عکرمہ سے مندرجہ ذیل سند و متن کے ساتھ روایت کیا ہے:

"حدثنا محمد بن المثنى ،قال : عبد الأعلى ،قال :ثنا داود عن عكرمة قال : قالت الجنوب للشمال ليلة الأحزاب : انطلقي ننصر رسول الله ﷺ ،فقالت الشمال ، ان الحرة لا تسري بالليل ، قال : فكانت الريح التي أرسلت عليهم الصبا". (أخرجه الطبري في تفسيره ۲۶۳/۱۰ (۲۸۳۵۹)

پہلے راوی: امام ابن جریر طبری جو کہ مشہور و معروف محدث و مفسر ہیں۔

دوسرے راوی: محمد بن مثنی بن عبید بن دینار، جن کے متعلق حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ :"ثقة ثبت". (تقريب ۵۶۲).

تیسرے راوی: عبد الاعلی بن عبد الاعلی، ان کے بارے میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ :"ثقة "(تقريب ۳۵۱).

پھر ان کے متابع بھی موجود ہیں جیسا کہ "المجالسة وجواهر العلم ۵۲۴/۳" اور "الأسامي والكنى ۸۸/۳" اور" علل الترمذي الكبير ۴۳۸/۲" وغیرہم میں بشر بن مفضل ہے، اور اس سے روایت کرنے والے دوسرے لوگ بھی ہیں۔

اور داود عن عکرمہ کے متعلق پیچھے ذکر ہو چکا۔

اسی طرح اس روایت کو امام ابن ابی الدنیا رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی کتاب " المطر والرعد والبرق(۱۳۲)" میں روایت کیا ہے جو کہ: ''عن قتادة أو داود بن أبي هند موقوف" ہے۔

اب ہم کذّاب و مُفتری علیزئی اور اس کے وہ ہمنوا جنہوں نے اس سے قبل اس بات کی وجہ سے اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ پر اعتراضات کئے ہیں اُن سے پوچھتے ہیں کہ:

کیا حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما جنہوں نے اس کو بیان کیا اور وہ تمام تابعین اور تبع تابعین جنہوں نے بیان کیا، اور وہ تمام آئمہ اسلام جنہوں نے اس بات کو روایت یا نقل کیا تمہارے نزدیک کیا حیثیت رکھتے ہیں؟ کیا وہ اللہ رب العزت پر جھوٹ گھڑنے والے کذّاب ہیں؟ نعوذ باللہ من ذلک۔

قسم بخدا! وہ لوگ نہ تو اللہ عزوجل پر جھوٹ بولنے والے اور نہ ہی کذاب ہیں، بلکہ ان پر اس وجہ سے اعتراضات کرنے والے تم لوگ تعلیماتِ اسلامیہ سے جاہل ہو۔

تمہیں چاہیے تو یہ تھا کہ اپنی جہالت پر ماتم کرتے لیکن نہ جانے تم لوگ عوام النّاس کے سامنے اپنے آپ کو عالِم منوانے کے لئے کیوں اہلِ اسلام اور بزرگانِ دین پر تہمت و افتراء باندھ کر اپنی عاقبت کو خراب کرنے کے درپے ہو گئے ہو، جس کی وجہ سے تمہارا انجام تو جو ہوگا سو ہوگا ہی لیکن نہ جانے تم لوگ کتنے سادہ لوح مسلمانوں کو بہکانے کا بھی ذریعہ بن رہے ہو، مگر یاد رکھنا کہ ان کا وبال روزِ قیامت تمہارے سروں پر ہوگا۔

اے الزام تراشو! ہوش کے ناخن لو، اور ذہن میں رکھو کہ اللہ تعالیٰ کا فرمانِ عالی شان ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا۔ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا﴾ [الأحزاب: ٥٧-٥٨]

جس کو صادق و مصدوق نبی ﷺ نے بڑے واضح انداز میں بیان فرمایا ہے اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح کی ''کتاب الرقاق'' میں روایت فرمایا ہے کہ:

" ان اللّٰه قال من عادى لي وليا فقد أذنته بالحرب ---الخ ۔

(صحيح البخاري جزء٨ ص١٠٥ (٦٥٠٢)-

ناعاقبت اندیشو! سوچو اللہ عزوجل اور اس کے رسول ﷺ سے دشمنی مول لے کر کس کو اپنا ولی و مددگار بناؤ گے؟۔

کیوں جناب! اب تو کن فیکون کی سمجھ آگئی یا ابھی بھی جناب مہمل و مختل کلام سے اوراق کو سیاہ کرنے کی سعئ لاحاصل کریں گے؟۔ اگر جناب مخموریت میں قلم کو حرکت دیں تو ہمیں انشاء اللہ اپنی طبع آزمائی کے لئے تیار پائیں گے۔

محمد ارشد مسعود 2010/12/09

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين وعلى آله وأصحابه أجمعين .

امابعد:

آج سے تقریباً بارہ (۱۲) سال قبل اہل سنت وجماعت کی طرف سے مناظرِ اسلام حضرت علامہ مولانا محمد عباس رضوی صاحب مدظلہ العالی نے غیر مقلدین پر بارہ (۱۲) سوال قائم کیے جن کی تشہیر تقریراً وتحریراً اور بذریعہ اشتہارات اور انٹرنیٹ پر بھی خوب کی گئی۔ آج بھی کئی ویب سائٹس اور (you tube) پر ہمارے سوالات موجود ہیں۔

پہلے گوجرانوالہ کے ایک لامذہب فاروق صارم نے ان کے جوابات دینے کی ناکام کوشش کی، جس کا جواب ''ڈھول کا پول'' نامی رسالہ میں دے دیا گیا۔

اس کے بعد انہی سوالات پر پروفیسر طالب ۔۔۔ آف راولپنڈی، ایک لامذہب وجاہل مناظر، سے انٹرنیٹ پر بعض دوستوں نے مناظرے کا اہتمام کیا، جس میں پہلے چار سوالوں پر گفتگو ہوئی تو اس نے تسلیم کیا کہ ان مسائل میں ہمارے پاس مذکورہ شرائط کے مطابق دلائل نہیں ہیں۔

بقیہ سوالات کے جوابات دینے کے لئے آئندہ مناظرے کا وقت متعین کرنے اور وعدہ کر لینے کے باوجود اس نے نہ آنے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔ یہ مناظرہ اب بھی مختلف ویب سائٹس پر موجود ہے۔

اب کافی عرصہ بعد ان سوالات کا جواب (مشہور لامذہب) زبیر علیزئی کی طرف سے آیا ہے۔ یہ جوابات پڑھ کر افسوس ہوا کہ جو شخص محدثین پر اعتراضات کرتے ہوئے، ان کے اقوال کو باطل ومردود کہتے ہوئے اور فقہاءِ امت پر نکتہ چینی کرتے ہوئے نہ تھکتا ہو، اس کا اپنا مبلغ علم یہ ہے۔

سب سے پہلے یہ عرض کرتے چلیں کہ لامذہبوں (غیر مقلدین) کا یہ نام نہاد محقق ومحدث ایسا پیدا ہوا ہے کہ اس نے لامذہبوں کے بنائے ہوئے اُصولوں کی ہی دھجیاں بکھیر دی ہیں۔

ان لامذہبوں (وہابیوں) کے بڑے تو خود کہتے اور لکھتے رہے کہ:

''بحمد للہ جماعت اہل حدیث (غیر مقلد، وہابی، لامذہب) صرف انہیں دو چیزوں پر عامل اور قائم ہے نہ تیسری چیز کی ضرورت دین میں تھی نہ انہیں محسوس ہوئی، نہ انہوں نے تیسری ہستی ٹٹولی''۔

(توحید محمدی ۹۱، مکتبہ محمدی R-7/ چیچہ وطنی، ساہیوال)

اور یہی جُوناگڑھی ایک اور مقام پر لکھتا ہے کہ:

''۔۔۔ایک مُٹھی میں قرآن لو دوسری میں حدیث لو جب تیسرا ہاتھ پیدا ہو تب تیسری چیز بھی پیدا کر لینا اب تو قرآن حدیث بس ہے باقی سب ہوس ہے۔۔۔''۔

(شمع محمدی ۲۷، مکتبہ محمدی R-7/ چیچہ وطنی، ساہیوال)

اور یہی جُوناگڑھی اسی کتاب میں لکھتا ہے کہ:

''ہمارا عقیدہ تو یہ ہے کہ جو قرآن حدیث میں جس طرح ہے وہی اسی طرح اسلام ہے جو اس میں نہیں وہ اسلام میں نہیں''۔

(شمع محمدی ۱۴۰، مکتبہ محمدی R-7/ چیچہ وطنی، ساہیوال)

سُنو اور غور سے سنو! یہی تمہارا بڑا جُوناگڑھی لکھتا ہے کہ:

''سنئے جناب! بزرگوں کی، مجتہدوں اور اماموں کی رائے قیاس اجتہاد واستنباط اور ان کے اقوال تو کہاں؟ شریعتِ اسلام میں تو خود پیغمبر اللہ ﷺ بھی اپنی طرف سے بغیر وحی کے کچھ فرمائیں تو وہ بھی حجت نہیں''۔ (طریق محمدی ص ۵۷، مکتبہ محمدی R-7/ چیچہ وطنی، ساہیوال)

یہی جوناگڑھی اسی کتاب میں لکھتا ہے کہ:

’’تعجب ہے کہ جس دین میں نبی کی رائے حجت نہ ہو اس دین والے آج ایک اُمتی کی رائے کو دلیل سمجھنے لگے‘‘۔

(طریق محمدی ص ۵۹، مکتبہ محمدی R-7 / چیچہ وطنی، ساہیوال)

اسی جوناگڑھی نے اسی کتاب میں لکھا ہے کہ:

’’جب اللہ کے پیغمبر کو یہ اجازت نہ تھی کہ اللہ کے دین میں اپنی طرف سے کچھ کہہ دیں پھر اماموں اور مجتہدوں کو یہ منصب اور یہ رُتبہ کیسے مل گیا؟۔

(طریق محمدی ص ۶۱، مکتبہ محمدی R-7 / چیچہ وطنی، ساہیوال))

اور مناظرہ حافظ آباد (فاتحہ خلف الامام) میں تو لامذہبوں کے مشہور مناظرین عبدالرشید ارشد، یحییٰ گوندلوی وغیرہما نے تحریراً یہ دعویٰ کیا تھا کہ ہمارے نزدیک اجتہاد، قیاس حجتِ شرعیہ نہیں ہے۔

یہ دعویٰ آج بھی ہمارے پاس محفوظ ہے اور ویڈیو کیسٹ میں بھی پڑھ کر سنا دیا گیا تھا۔

مگر یہ لامذہب وقت پڑنے پر اجماع، اجتہاد اور قیاس کو بھی دلیل تسلیم کرتا ہے۔

وہابیو! دیکھنا کہیں یہ تم میں ’’آدھا تیتر آدھا بٹیر‘‘ تو پیدا نہیں ہو گیا؟۔

اس لئے ہم کہتے ہیں کہ ان لوگوں کا کوئی مذہب نہیں ہے، ان کے بڑے کچھ کہتے اور لکھتے رہے، یہ آج کچھ اور کہہ اور لکھ رہے ہیں۔ مگر یہ بات قابلِ افسوس نہیں، کیوں کہ یہ وہ گروہ ہے جو شہر بدلنے سے اپنا مسلک بدل لیتا ہے۔ یہ وہ گروہ ہے جو ملک بدلنے سے، زمانہ بدلنے سے، حکومت بدلنے سے نظریات تبدیل کر لیتے ہیں۔

مثال کے طور پر ملاحظہ فرمائیں:

مولوی عبداللہ خانپوری نے ایک کتاب ’’تذکرہ علمائے خانپور‘‘ لکھی جس میں اس نے

اپنے لامذہب مولویوں کے تذکرے لکھے ہیں، اس میں وہ قاضی عبدالاحد بن قاضی محمد حسن [م ۱۹۲۸ء] کے تذکرہ میں لکھتا ہے کہ:

(قاضی عبدالاحد) ’’شہر کی مختلف مساجد میں نماز کے لئے جاتے اور جو کچھ وہاں دیکھتے وہاں کے امام سے چند سوالات کر کے اسے راہ پر لے آتے، اس غرض کے لئے مساجد احناف میں وہ آمین بالجبر اور رفع الیدین بھی نہ کرتے تھے‘‘۔

(تذکرہ علمائے خانپور ۳۸، المکتبۃ السلفیۃ، لاہور۔)

آمدم بر سر مطلب:

ہمارا سوال نمبر (۱)

کیا نبی اکرم ﷺ نے نمازِ وتر میں بعد از رکوع عام دُعا کی طرح ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگی ہے یا آپ ﷺ نے حکم فرمایا ہے؟

جواب علیزئی لا مذہب:

نبی کریم ﷺ کے (۷۰) صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین جب شہید ہوگئے تو آپ نے ایک مہینہ صبح کی نماز میں قنوت پڑھا تھا جیسا کہ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ حدیث سے ثابت ہے۔ دیکھئے صحیح بخاری (کتاب المغازی باب ۲۹ ح ۴۰۹۰)

سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "فقد رأيت رسول الله ﷺ كلما صلى الغداة رفع يديه يدعو عليهم" پس یقیناً میں نے دیکھا، رسول اللہ ﷺ جب صبح کی نماز پڑھتے، دونوں ہاتھ اٹھاتے، ان (کافروں) پر (ہلاکت وتباہی) کی دعا فرماتے۔

(صحیح ابی عوانہ ج ۵ ص ۴۱، دوسرا نسخہ ج ۴ ص ۲۷ ح ۵۹۱۳ وسندہ صحیح)

اس حدیث سے قنوت میں دعا کی طرح ہاتھ اٹھانا ثابت ہے لہٰذا جو اہلِ حدیث قنوتِ وتر میں ہاتھ اُٹھاتے ہیں، اس حدیث اور آثار کی بنا پر اُٹھاتے ہیں۔

امام اہلِ سنت امام احمد بن حنبل اور امام اسحاق بن راہویہ دونوں قنوتِ وتر میں ہاتھ اُٹھانے کے قائل تھے۔ دیکھئے مسائل ابی داؤد (ص ۶۶) اور مسائل احمد واسحاق (روایۃ اسحاق بن منصور الکوسج ۱/۲۱۱ ت ۴۶۵)

اقول:

سوال گندم جواب چنا، یعنی سوال ہے نمازِ وتر کا اور جواب ہے نمازِ فجر کا، سوال ہے دُعائے قنوت کا

اور جواب ہے قنوتِ نازلہ کا، ماشاء اللہ، کیا ہی مُحدِّثانہ تحقیق ہے؟

اولاً: سوال ہے ہمیشہ کا اور جواب ہے ایک مہینہ کا۔

کیا علیزئی صاحب یہ بتا سکتے ہیں کہ جو کام رسول اللہ ﷺ نے صرف ایک مہینہ کیا ہو اور اللہ عزّوجل کے حکم سے اس کو ترک کر دیا ہو اُس پر ساری عُمر عمل کرنا رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ہے یا کہ رسول اللہ ﷺ سے بغاوت؟۔

ارشادِ ربّ العالمین ہے:

﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ﴾

[آل عمران: ۱۲۸]

اس آیت مبارکہ کا شانِ نزول مُلاحظہ فرمائیں:

امام بخاری اپنی صحیح اور امام مسلم اپنی صحیح میں حضرت سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں (امام مسلم کے الفاظ یہ ہیں)

"كان رسول الله ﷺ يقول حين يفرغ من صلاة الفجر من القراءة و يكبر و يرفع رأسه سمع الله لمن حمده ربنا ولك الحمد ثم يقول : و هو قائم اللّٰهم أنج الوليد بن الوليد و سلمة بن هشام و عياش بن أبي ربيعة والمستضعفين من المؤمنين اللّٰهم اشدد وطأتك على مضر واجعلها عليهم كسني يوسف اللّٰهم العن لحيان ورعلا وذكوان وعصية عصت الله ورسوله ثم بلغنا أنه ترك ذلك لما أنزل ﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ﴾ (أخرجه مسلم في الصحيح، في الصلاة، (٦٧٥) و البخاري في الصحيح، في التفسير (۴۲۸۴) وغيرهما)

علیزئی صاحب! اپنے گروہ کو یہ بھی بتا دینا تھا کہ یہ جو ہمارا کام ہے اور جس پر ہم لا مذہب کار بند ہیں یہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کو وحی کے ذریعے کرنے سے منع کر دیا تھا۔

لیکن یہ جناب نہیں بتائیں گے کیونکہ اس سے جناب کے حواری جناب سے ناراض ہو کر آج سے پہلے ساری زندگی میں جو کیا ہے اس کا سوال کریں گے، جس کی وجہ سے جناب کو ندامت اُٹھانا پڑے گی، لیکن علیزئی صاحب ہمارا آپ کو مشورہ ہے کہ اس فانی دنیا کی چند روزہ زندگی کو اُخروی دائمی زندگی پر ترجیح مت دیں۔

رسول اللہ ﷺ تو ایک ماہ ایک عمل کریں اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم کے تحت اس کو ہمیشہ کے لئے ترک کر دیں اور جناب اپنے حواریوں کو ساری زندگی کرنے کے دلائل فراہم کریں، کیا یہی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اِتّباع ہے؟

یہ فعل ترک کرنا حکم ربانی اور رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے، جس پر الحمد للہ اہل سنت و جماعت کار بند ہیں۔

جناب نے لکھا ہے کہ: ''عباس رضوی نامی ایک بریلوی نے اہل حدیث (اہل سنت) سے بارہ سوالات کئے ہیں''

جناب من! ویسے جناب کا یہ لکھنا عجیب سا لگا ہے۔

جیسا کہ آپ اس نام اور شخصیت سے بالکل ہی ناواقف ہیں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے، جناب کی یاددہانی کے لئے عرض ہے کہ سرزمینِ گوجرانوالہ میں جناب اپنی جماعت کے مناظر طالب۔۔۔شاہ کے ساتھ جب اپنی تحقیق ظاہر کرنے تشریف لائے تھے تو یہی شخصیت تھی جس نے جناب کو کہا تھا کہ پیچھے سے مشورہ دینے کی بجائے خود مناظر بن کر سامنے آیئے، مگر اس وقت جناب کو کیا ہوا تھا؟ شاید جناب کو سانپ سُونگھ گیا تھا۔ ویسے حاضرین تو جناب کے

چہرے کی رنگت کے بدل جانے سے ہی جان گئے تھے۔

یہ وہی شخصیت تھی جن کے سوالوں کے جوابات نہ بن پڑنے پر جنابِ من اور جناب کی جماعت کے مناظر مع معاونین، اس شخصیت کے نماز پڑھنے کے دوران۔۔۔دُم دبا کر بھاگ گئے تھے۔

اگر یادداشت ساتھ نہ دے تو آج بھی مناظرۂ وسیلہ کے کیسٹ منگوا کر یادداشت کو تازہ کر لیجئے۔

ویسے آپ کے بڑے تو اپنے آپ کو وہابی، اہلحدیث ہی لکھتے رہے اور اپنے مدِّ مقابل احناف کو اہلِ سنت لیکن آج کل یہ آپ کے لا مذہب گروہ پر کیا بُھوت سوار ہوا ہے کہ اپنے آپ کو اہل سنت میں شامل کرنے کے لئے کبھی ''اصلی اہلِ سنت'' اور کبھی ''اہلِ سنت'' لکھنا شروع کر دیا ہے اور عمل یہ کہ جس کو بحکم ربانی رسول اللہ ﷺ نے ترک کیا اس پر دوام؟ فیا للعجب۔

ثانیا: اب آیئے حضرت انس رضی اللہ تعالی عنہ کی روایت کی طرف، اس روایت کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں کئی ایک مقامات پر بیان فرمایا ہے، کہیں مختصر اور کہیں تفصیلاً۔

حضرت قتادہ حضرت انس رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ:

" قنت رسول اللہ ﷺ شهرا بعد الركوع يدعوا على أحياء من العرب ".

(صحيح البخاري، كتاب المغازي).

مذکورہ بالا حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیان کردہ حدیث مبارکہ میں بعد از رکوع قنوت پڑھنے کا ذکر ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی موجود ہے کہ " قنت رسول اللہ ﷺ شهرا بعد الركوع" یعنی رکوع کے بعد جو قنوت (نازلہ) پڑھی گئی وہ ایک ماہ تھی۔

اب صحیح بخاری میں ہی حضرت انس رضی اللہ تعالی عنہ کی بیان کردہ مفصّل روایت کو مُلاحظہ فرمائیں

حضرت عاصم فرماتے ہیں:

" سألت أنس بن مالك عن القنوت فقال : قد كان القنوت ،قلت : قبل الركوع أو بعده ؟ قال: قبله ،قال : فان فلانا أخبرني عنك قلت بعد الركوع فقال : كذب انما قنت رسول الله ﷺ بعد الركوع شهرا أراه كان بعث قوما يقال لهم القراء زهاء سبعين رجلا الى قوم من المشركين دون أولئك و كان بينهم و بين رسول الله ﷺ عهد فقنت رسول الله ﷺ شهرا يدعوا عليهم .

(أخرجه البخاري في الصحيح ، في الوتر، ح ١٠٠٢)

اس حدیث مبارکہ سے واضح ہوگیا کہ ایک ماہ کے علاوہ بعد از رکوع دُعائے قنوت کو جو حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بیان کرتا ہے وہ بقول حضرت انس رضی اللہ عنہ کذّاب ہے۔

ایک ماہ نبی اکرم ﷺ سے بعد از رکوع قنوتِ نازلہ پڑھنا ثابت ،لیکن ساتھ ہی اس کا منسوخ ہونا حکم ربانی اوراس کا ترک کر دینا سنتِ رسول اللہ ﷺ ہے۔

پس اب جوکوئی اس ایک ماہ کے بعد بھی ،رکوع کے بعد وتروں میں قنوت پڑھنے کوسنت قرار دیتا ہے یا عمل کرتا ہے اس کے بارے میں کیا حکم ہے، یہ علیزئی بتائے؟۔

کیالا مذہب اس عمل کو اُمّت کے لئے سنت سمجھتے ہیں جو رسولُ اللہ ﷺ نے ترک کر دیا؟۔

عبدالرؤف لامذہب نے وتروں میں پڑھی جانے والی قنوت کے بارے میں مختلف روایات کے جوابات دینے کے بعد لکھا کہ: "خلاصہ رسول اللہ ﷺ کے قول، فعل اور صحابہ کے عمل سے قنوت قبل الرکوع ہی ثابت ہے"۔ (صلوۃ الرسول ۴۰۱)

اب واضح ہوگیا کہ ہمارا سوال کہ "کیا نبی اکرم ﷺ نے نمازِ وتر میں بعد از رکوع۔۔۔الخ"۔

ابھی تک علیزئی اور پوری لامذہبوں کی ذُرّیت کی گردنوں پر باقی ہے۔جس کووہ تا قیامِ قیامت اُتار نہیں سکیں گے،ان شاء اللہ العزیز۔

ثالثًا: علیزئی صاحب کا یہ لکھنا کہ:

"سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا:" فقد رأيت رسول الله ﷺ كلما صلى الغداة رفع يديه يدعو عليهم " پس یقیناً میں نے دیکھا، رسول اللہ ﷺ جب صبح کی نماز پڑھتے ، دونوں ہاتھ اٹھاتے ، ان (کافروں) پر (ہلاکت وتباہی) کی دعا فرماتے ۔

(صحیح ابی عوانہ ج ۵ ص ۴۱ ، دوسرا نسخہ ج ۴ ص ۲۷ ح ۵۹۱۳ وسندہ صحیح)"۔

جواس کے اپنے جواب کی ہی تکذیب کررہا ہے، اور یہ روایت نقل کر کے علیزئی نے ثابت کردیا کہ اس مسئلہ میں وہ بیچارہ لاجواب ہی نہیں بلکہ بے بس بھی ہے۔

علیزئی کی بیان کردہ روایت میں نمازِ وتر کا ذکر نہیں ہے بلکہ اس میں صبح کی نماز کا ذکر ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لامذہبوں کے اس مُحقّق وذہبیٔ زمان کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے۔اور نہ ہی اس روایت میں صراحت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کب ہاتھ اُٹھا کر دعا کرتے تھے، جیسا کہ علیزئی کے ترجمہ سے ہی ظاہر ہے، اس میں نہ تو قبل از رکوع کا ذکر ہے اور نہ ہی بعد از رکوع کا۔

لہٰذا ہمارا سوال ہے کہ "۔۔۔نمازِ وتر میں بعد از رکوع عام دُعا کی طرح ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگی ہے یا آپ ﷺ نے حکم فرمایا ہے؟۔" ابھی تک اپنی جگہ قائم ہے۔جس کا علیزئی اور لامذہبوں کے پاس کوئی جواب نہیں، ان شاءاللہ۔

رابعًا: علیزئی کا یہ لکھنا کہ "اس حدیث سے قنوت میں دعا کی طرح ہاتھ اٹھانا ثابت ہے، لہٰذا جو اہل حدیث قنوت وتر میں ہاتھ اٹھاتے ہیں، اس حدیث اور آثار کی بنا پر اٹھاتے ہیں۔"

سبحان اللہ ! علیزئی صاحب اور تمام لامذہبوں کو مبارک ہو کہ ان کا عمل نہ تو کسی صحیح ، صریح ، مرفوع حدیث سے ثابت ہو سکا اور نہ ہی وہ اس کو ایڑی چھوٹی کا زور لگانے کے باوجود سنت

ثابت کر سکے، بلکہ صرف اپنی لنگڑی لولی سوچ و عقل پر انحصار کر کے قنوت نازلہ جو کہ ایک ماہ پڑھی گئی تھی اس کو دلیل بنا کر قنوتِ وتر میں ہاتھ اُٹھانا ثابت کرنے لگے۔

انہی کے ایک لا مذہب نے لکھا کہ ''ناظرین! وتر کی دعائے قنوت میں بھی صرف آدابِ دعا کی وجہ سے ہاتھ اٹھائے جاتے ہیں ورنہ حدیث میں اس کا کوئی ثبوت ذکر نہیں ہوا۔ لہٰذا دعا میں ہاتھ اٹھانا دعا کے آداب میں شامل ہے ورنہ وتروں میں بھی نہ اٹھائے جائیں۔

(بشیر الرحمٰن سلفی، روح عبادت الدعاء ص ۱۸)۔

ع اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔

بشیر الرحمٰن سلفی لا مذہب کی عبارت سے معلوم ہوا کہ نمازِ وتر کی دعائے قنوت میں ہاتھ اُٹھانا ثابت نہیں، لہٰذا ہمارا سوال ابھی تک قائم و دائم ہے، بلکہ انہی کے گھر کی تائید رکھتا ہے۔

خامسًا: علیزئی کا یہ لکھنا کہ ''امام اہل سنت امام احمد بن حنبل اور امام اسحاق بن راہویہ دونوں قنوت وتر میں ہاتھ اٹھانے کے قائل تھے۔ دیکھئے مسائل ابی داؤد (ص ۶۶) اور مسائل احمد و اسحاق (روایۃ اسحاق بن منصور الکوسج ۱/۲۱۱ ت ۴۶۵)۔''

سبحان اللہ! علیزئی صاحب! کیا یہ بات یعنی دونوں آئمہ کا فعل آپ کے نزدیک حجت ہے؟۔ جب کہ اس سے پہلے مذکورہ بالا سوال کے جواب میں نہ تو آپ کوئی صریح دلیل پیش کر سکے ہیں اور نہ ہی کر سکتے ہیں پھر ان دونوں آئمہ کے فعل کو کیا آپ نے حجت تسلیم کر لیا ہے، اگر کہیں کہ تائید کے طور پر تو تائید کے طور پر تب پیش کرتے جب پہلے کوئی صحیح، صریح دلیل قائم کرتے، جب کہ وہ تو آپ کر نہ سکے۔

پس ان دونوں اماموں کا فعل آپ کو فائدہ مند نہیں جب تک کوئی صریح، صحیح، مرفوع حدیث پیش نہیں کر سکتے، اور وہ جناب کر نہیں سکیں گے ان شاء اللہ العزیز۔

ہمارا سوال نمبر (۲)

کیا نبی اکرم ﷺ نمازِ جنازہ کی تمام تکبیرات میں رفع الیدین کرنے کا حکم فرماتے یا آپ ﷺ نے خود نمازِ جنازہ کی تمام تکبیروں کے ساتھ رفع الیدین فرمایا ہے؟۔

جواب علیزئی لا مذہب :

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ: ''أن النبي ﷺ كان اذا صلى على جنازة رفع يديه في كل تكبيرة واذا انصرف سلم.''

بے شک نبی ﷺ جب نماز جنازہ پڑھتے تو ہر تکبیر کے ساتھ رفع الیدین کرتے اور جب پھرتے تو سلام کہتے تھے۔ (العلل للدارقطني ج ۱۳ص ۲۲ مسئلة: ۲۹۰۸ وسنده صحيح وزيادة الثقة مقبولة)

اس حدیث کے راوی سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ (بھی) جنازے کی ہر تکبیر پر رفع یدین کرتے تھے۔ (دیکھئے مصنف ابن ابی شیبہ ۳/۲۹۶ ح ۱۱۳۸۰، وسندہ صحیح)۔''

اقول:

جنابِ من، نہ صرف من بلکہ دو من! اتنی بھی بے انصافی اچھی نہیں ہوتی۔

اگر جناب نے امام دارقطنی کی علل سے ہی یہ روایت نقل کی ہے تو اس کا متن ذکر کرنے کے ساتھ جو امام دارقطنی کا اپنا فیصلہ تھا اس کو بھی ذکر کر دینا تھا، لیکن شاید وہ جناب کی طبیعت کے موافق نہیں تھا اور اس کو نقل کرنے سے جناب کا بھرم ٹوٹ جانا تھا اس لئے جناب نے اس کو ذکر نہ کرنے میں ہی اپنی عافیت سمجھی، لیکن لیجئے امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ کی مکمل عبارت ہم نقل کرتے ہیں ملاحظہ ہو:

''وسئل عن حديث نافع، عن ابن عمر : أن النبي ﷺ كان اذا صلى على جنازة .... الحديث . فقال : يرويه يحيى بن سعيد الأنصاري ، واختلف عنه :

فرواه [عمر] بن شبة ، عن يزيد بن هارون ، عن يحيى بن سعيد ، عن نافع ، عن ابن عمر ، عن النبي ﷺ. وخالفه جماعة ، رووه عن يزيد بن هارون موقوفا . وكذالك رواه عبد الرحمن بن اليمان شيخ يروي عنه الأوزاعي ، و أبو شهاب الحناط ، وغيرهما عن نافع عن ابن عمر موقوفا . وهو الصواب .

(العلل ۲۲.۲۱/۱۳)

جناب نے امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ ہضم کیا تو آخر کیوں؟

یہ روایت مرفوع صحیح نہیں ہے بلکہ یہ موقوف ہے۔ موقوف تو جناب کے ہاں قابلِ حجت ہی نہیں۔

لہٰذا ثابت ہو گیا کہ ہماری شرائط کے مطابق جناب سے کوئی جواب نہیں بن پڑا، پس ہمارا سوال ابھی تک علیزئی و دیگر لامذہبوں پر اسی طرح برقرار ہے۔

ہمارا سوال نمبر ﴿۳﴾

حضور اکرم ﷺ نے اپنے کس صحابی کی شہادت پر غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھائی تھی؟۔

جواب علیزئی لا مذہب :

سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے: " صلى رسول الله ﷺ على قتلى أحد بعد ثماني سنين " الخ ۔ رسول اللہ ﷺ نے شہدائے اُحد پر آٹھ سال کے بعد نماز جنازہ پڑھی تھی۔ (صحیح بخاری کتاب المغازی باب غزوۃ احد ح ۴۰۴۲)

اس کا جواب صارم کے جواب الجواب سے ہی پیش ہے:

اقول: سبحان اللہ!

تحقیق ہو تو ایسی، بات ہو رہی ہے شہید کے غائبانہ نماز جنازہ کی اور دلیل دی جا رہی ہے مطلق نمازِ جنازہ کی۔

مجیبِ ثانی یہ تسلیم کرتا ہے کہ یہ نماز آپ ﷺ نے اُحد شریف جا کر پڑھائی تھی، جب کہ مجیبِ اول اس کو غائبانہ ثابت کر رہا ہے کہ یہ مدینہ شریف میں پڑھائی تھی۔

پھر اس حدیث کی تفہیم میں بھی کافی اختلاف ہے، حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

" قال النووی: المراد بالصلوة هنا الدعاء، وأما كونه مثل الذي على الميت فمعناه أنه دعا لهم بمثل الدعاء الذي كانت عادته أن يدعو به للموتى.

(فتح الباری ۱۶۴/۳ ، وفي نسخة ۸۴۰۱)

امام نووی نے فرمایا کہ یہاں "صلوۃ" بمعنی دُعا ہے اور یہ کہنا کہ جیسے میت کے لئے صلوٰۃ پڑھتے ہیں، تو اس کا معنی یہ ہے کہ اس طرح دُعا کی جس طرح مرنے والوں کے لئے دُعا کرنے کی آپ ﷺ کی عادت مبارکہ تھی۔

امام ابوزرعہ عراقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

"ان المراد بها الدعاء وليس المراد بها صلوة الجنازة المعهودة، قال النووی: أي دعا لهم بدعاء صلاة الميت. (طرح التثريب في شرح التقريب ۲۹۵/۳)

یہاں "صلوۃ" سے مُراد دُعا ہے نہ کہ نمازِ جنازہ، اور امام نووی نے فرمایا کہ ان کے لئے میت والی دُعا مانگی۔

پس ثابت ہوا کہ لامذہبوں، غیر مقلدوں کے پاس اس کی کوئی صحیح، صریح، مرفوع حدیث دلیل میں پیش کرنے کے لئے نہیں ہے، بلکہ اگر ضعیف بھی ہوتی تو ضرور پیش کرتے۔

سوال نمبر ﴿۴﴾

ایک صحیح، صریح، مرفوع حدیث پیش کریں کہ نمازِ جنازہ میں امام دُعائیں بلند آواز سے پڑھے اور مقتدی صرف آمین آمین پکاریں؟۔

جواب علیزئی لا مذہب :

سیدنا عوف بن مالک الاشجعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ "سمعت النبي ﷺ و صلى على جنازة يقول : اللهم اغفر له وارحمه " الخ .

میں نے نبی ﷺ کو جنازے پر نماز پڑھتے ہوئے سنا آپ فرما رہے تھے: ((اللهم اغفر له وارحمه .)) الخ. (صحیح مسلم ۸۵/۹۶۳، ترقیم دارالسلام: ۲۲۳۴)

جو دُعا بلند آواز سے پڑھی جائے وہی سنی جاتی ہے، لہٰذا اس صحیح حدیث سے بلند آواز سے دعا پڑھنا ثابت ہوا۔

اس کا جواب بھی صارم کے جواب الجواب سے پیش کیا جاتا ہے لیکن علیزئی صاحب کی طبیعت کے مطابق کچھ اضافہ وتصرف کے ساتھ:

اقول :

نمازِ جنازہ سراً پڑھنا ہی سنت ہے، جہراً نہ آپ ﷺ نے پڑھا اور نہ ہی اس کا حکم فرمایا ہے، اور نہ ہی تا قیامت کوئی لا مذہب اس کو مذکورہ شرائط کے مطابق ثابت کر سکتا ہے۔

پس علیزئی کی متدل روایت کو پڑھنے کے بعد میں یہی کہوں گا کہ "ڈوبتے کو تنکے کا سہارا"۔ کوئی صحیح، صریح، مرفوع دلیل مل نہیں سکی، پس علیزئی صاحب مذکورہ بالا روایت کا سہارا لے کر اپنے حواریوں وانصاریوں اور لیلٰے نجد کے اسیروں کو خوش کرنے کے لئے اپنی سوچ بروئے کار لاتے ہوئے اور نجد تک دُور کی سُوجھتے ہوئے لکھ مارا کہ "جو دعا بلند آواز سے پڑھی جائے وہی سُنی جاتی ہے"۔

علیزئی صاحب! امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

"واما الدعاء فيسر به بلا خلاف وحينئذ يتاول هذا الحديث على ان قوله

حفظت من دعائه أي علمنيه بعد الصلوة فحفظته. (شرح مسلم للنووي ۱/۳۱۱)

اور جنازہ میں دُعا بالاتفاق سراً پڑھی جائے گی پس اس حدیث کی تاویل یہ ہوگی کہ صحابی کا فرمانا کہ مَیں نے دُعا حفظ کر لی یعنی آپ ﷺ نے نمازِ جنازہ کے بعد مجھ کو دُعا سکھلائی تو میں نے اس کو حفظ کر لیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ امام نووی کے دَور تک کوئی قوم جنازہ میں دُعائیں بلند آواز سے پڑھنے والی نہیں تھی، یہ بعد کے دَور کی پیداوار ہے۔

علیزئی صاحب! جناب کا ہی ایک بھائی، مولوی عبدالرؤف لکھتا ہے:

"مگر اس حدیث سے حجت لینا محلِ نظر ہے کیونکہ مسند احمد (۲۳/۶) میں عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے الفاظ یہ ہیں " ففهمت من صلوته عليه اللهم اغفرله ..." یعنی میں آپ کی نماز سے یہ کلمات سمجھا۔ بظاہر اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دھیمی آواز میں دُعاء پڑھی ہوگی اور عوف بن مالک آپ ﷺ کے قریب کھڑے ہوں گے لہٰذا انہوں نے یہ دُعاء سُن لی۔ واللہ اعلم

نمازِ جنازہ کی دُعاؤں کے بارے میں جو دوسری روایات ہیں ان سے بھی دُعاؤں کو جہراً پڑھنے پر استدلال کیا جاتا ہے ان روایات سے بھی استدلال کی نوعیت بالکل وہی ہے جو عوف بن مالک سے استدلال کی نوعیت ہے۔۔۔۔ الحاصل: نمازِ جنازہ میں قرات سراً پڑھنی چاہئیے کیونکہ اس بارے میں نص موجود ہے۔ (صلاۃ الرسول ۴۸۳۔۴۸۴)

تو ثابت ہوا کہ جب سرے سے نمازِ جنازہ بلند آواز سے پڑھنی ہی سنت کے خلاف ہے تو آمین آمین والا مسئلہ خود بخود بدعت ٹھہرے گا۔

مولوی محمد عبدہ فیروز آبادی لا مذہب نے لکھا ہے:

''جمہور علماء سری کے قائل ہیں امام شوکانی لکھتے ہیں:''و ذهب الجمهور الى انه لا يستحب الجهر في صلاة الجنازة''. (نيل الاوطار ۶۶/۴) اور حضرت ابن عباس والی حدیث کا جواب ظاہر ہے وہ خود فرما رہے ہیں: ''لم اقرأ أي جهرا الا لتعلموا أنه سنة''.

اور پھر حضرت ابوامامہ بن سہل سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ کے صحابہ میں سے ایک شخص نے بتایا نماز جنازہ میں سنت یہ ہے کہ آہستہ پڑھی جائے۔

(احکام الجنائز ۱۸۷۔۱۸۸)

تنبیہ : حدیث کے الفاظ ''میں نے آپ سے یہ دعا یاد کرلی'' سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت یہ ادعیہ بآواز بلند پڑھتے تھے، لیکن مُلا علی قاری اس کی تاویل کرتے ہوئے لکھتے ہیں: یہ اسرار بالدعا کی مندوبیت کے خلاف نہیں کیونکہ یہاں جھرا (اگر ثابت ہو تب) پڑھنا محض تعلیم کے لئے تھا۔

(احکام الجنائز ۱۹۱)

حافظ محمد گوندلوی لامذہب نے لکھا:

''نماز جنازہ میں نمازی اپنی جگہ دعا کرے، صرف آمین کا کہیں ذکر نہیں ہے۔

(فتاوی علمائے حدیث ۱۵۳/۵)

ایک اور لامذہب جس کا تعلق ''الاعتصام'' والے لامذہبوں سے ہے، لکھتا ہے:

''نماز جنازہ کی دُعاؤں پر مقتدیوں کے آمین کہنے کا ثبوت جہاں تک راقم کو معلوم ہے آنحضرت اور عہد صحابہ وتابعین میں نہیں ملتا بنا بریں اس امر کو خلافِ سنت کہا جائے گا۔

(فتاوی علمائے حدیث ۱۹۱/۵)

علیزئی کا لکھنا کہ:

''ایک حدیث میں آیا ہے کہ نبی ﷺ قنوت (دعائے قنوت) پڑھتے تھے اور لوگ آپ کے پیچھے

آمین کہتے تھے۔(سنن ابی داود، الوتر باب القنوت فی الصلوة ح ۱۴۴۳، و سنده حسن و صححه ابن خزيمه :۶۱۸، والحاكم على شرط البخارى ۲۲۵/۱ ووافقه الذهبى)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر دعا جہری ہو تو مقتدی آمین کہیں گے۔''

اقول : اولاً : سبحان اللہ !

علیزئی صاحب! پوری روایت نقل کرنے سے جناب نے احتراز کیوں کیا؟

خیر یہ تو آپ کا معاملہ تھا، آئیے ہم پوری روایت نقل کرتے ہیں، ملاحظہ ہو:

'' عن ابن عباس قال : قنت رسول الله ﷺ شهرا متتابعا في الظهر والعصر والمغرب والعشاء وصلاة الصبح في دبر كل صلاة اذا قال : سمع الله لمن حمده من الركعة الآخرة يدعو على احياء من بني سليم على رعل و ذكوان و عصية و يؤمن من خلفه . (سنن أبي داود)

علیزئی صاحب! یہ کرشمہ ہے لامذہبیت کا کہ بات تھی نمازِ جنازہ کی دُعاؤں کی اور جواب میں دلیل پیش کی جارہی ہے قنوتِ نازلہ کی۔ کیا ہی جواب ہے لامذہب کا۔

علیزئی صاحب! قنوتِ نازلہ کی بجائے ''قنوت (دعائے قنوت)'' کے الفاظ لکھ کر اور حقیقت کو چھپا کر کیا ثابت کرنے لگے تھے؟

یہ نمازِ وتر کی قنوت کی بات بھی نہیں ہے یہ قنوتِ نازلہ کی بات ہے جو کہ صرف ایک مہینہ پڑھی گئی تھی۔ آپ نے تو بڑی چالاکی سے اگلے پچھلے الفاظ کو جمع کر کے حدیث مبارکہ کے اصل مفہوم کو ہی بدل دیا کہ جو خاص تھی قنوتِ نازلہ سے اس کو یوں ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ قنوتِ وتر محسوس ہو، ورنہ ایک مہینہ کے الفاظ لکھے۔

علیزئی صاحب! اتنا ہیر پھیر کہ حدیث مبارکہ کے پہلے لفظ "قنت رسول الله ﷺ" لے کر اگلے سارے الفاظ چھوڑ کر پھر "ویؤمن من خلفه" کے الفاظ لے رہے ہیں، کیا خیال تھا کہ شاید پردہ رہ جائے؟

جناب یہ قنوت (نازلہ) ہی ہے جو کہ صرف ایک ماہ پڑھی گئی جس کو بعد میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت ترک کر دیا گیا جیسا کہ پیچھے حضرت انس رضی اللہ تعالی عنہ کی روایت کے تحت ذکر ہو چکا۔

ثانیًا: یہی روایت جس کو علیزئی صاحب نے مذکورہ بالا حوالوں کے ساتھ نقل کیا ہے اسی کو صارم نے "قیام اللیل للمروزی" کے حوالے سے نقل کیا تھا جس کا جواب صارم کے جواب الجواب کے تحت آرہا ہے۔

ہماراسوال نمبر (۵)

ایک صحیح، صریح، مرفوع حدیث پیش کریں کہ نمازِ وتر میں رکوع کے بعد امام بلند آواز سے دعائے قنوت پڑھے اور مقتدی آمین آمین پکاریں؟۔

جواب علیزئی لا مذہب:

رسول اللہ ﷺ نے ایک مہینہ ظہر، عصر، مغرب عشاء اور صبح کی نمازوں میں قنوت پڑھا تھا اور آپ کے پیچھے نماز پڑھنے والے آمین آمین کہتے تھے۔

دیکھئے سنن ابی داؤد (ح ۱۴۴۳، وسندہ حسن) اور الجواب نمبر ۴۔ اس حدیث سے امام کا بلند آواز سے قنوت پڑھنا اور مقتدیوں کا آمین کہنا، دونوں مسئلے ثابت ہیں۔ والحمدللہ

اقول:

اولًا: واہ رے لا مذہبوں کے مُحقّق تیری تحقیق کے قربان! سوال نمازِ وتر میں قنوت کا ہے اور جواب ظہر، عصر، مغرب عشاء اور صبح کی نمازوں میں پڑھی جانے والی قنوتِ نازلہ سے۔

ثانیًا: علیزئی صاحب نے "وسنده حسن" لکھ کر یہ تسلیم کر لیا کہ اس مسئلہ میں جیسی بھی غیر صریح ہمارے پاس دلیلیں ہیں ان میں کوئی بھی صحیح نہیں ہے، ورنہ صحیح کو پیش کرتے۔

علیزئی صاحب! کیا یہ سب کچھ جناب نے اپنے حواریوں کو خُوش کرنے کے لئے ہی لکھا ہے؟، حقیقت میں تو جناب نے چُن چُن کر بے محل دلیلیں نقل کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رہنے دی، کوئی دلیل تو شرائط کے مطابق بیان کر دیتے۔

اللہ کے بندے! سوال وتروں کی قنوت کا ہے اور جناب نے ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور فجر کی نمازوں والی روایت ذکر کر دی، پہلے تو رسول پاک ﷺ سے دعائے قنوت في الوتر بلند آواز سے ثابت کرو، مگر وہ آپ قیامت تک نہیں کر سکتے۔

چلے ہو ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور فجر کی نمازوں میں پڑھی جانے والی قنوتِ نازلہ میں کہی جانے والی آمین کو قنوت في الوتر پر قیاس کرنے۔

ہمارا سوال نمبر (۶)

کیا نبی اکرم ﷺ نے حکم فرمایا تھا کہ نماز میں ہاتھ سینہ پر باندھے جائیں یا آپ ﷺ نے خود نماز میں سینے پر ہاتھ باندھے تھے؟

جواب علیزئی لا مذہب:

سیدنا سہل بن سعد سے روایت ہے کہ "كان الناس يؤمرون أن يضع الرجل يده اليمنى على ذراعه اليسرى في الصلوة" لوگوں کو حکم دیا جاتا تھا کہ ہر شخص نماز میں اپنا دایاں ہاتھ اپنی بائیں ذراع پر رکھے۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۰۲ ح ۷۴۰)

کُہنی کے سرے سے لے کر درمیانی اُنگلی کے سرے تک کو ذراع کہتے ہیں۔ دیکھئے القاموس

الوحید (٥٦٨) اگر دایاں ہاتھ پوری ذراع پر رکھا جائے تو خود بخود سینے پر آجاتا ہے لہٰذا ثابت ہوا کہ نماز میں سینے پر ہاتھ باندھنا چاہئے۔ سیدنا ہلب الطائی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ " **یضع ھذہ علی صدرہ** " آپ (ﷺ) یہ (ہاتھ) اپنے سینے پر رکھتے تھے۔

(مسند احمد ج ٥ ص ٢٢٦، وسندہ حسن)

اقول:

اولاً: علیزئی نے صحیح بخاری کی حدیث لکھ کر اپنے مذہب کا جنازہ ہی نکال دیا ہے اور پھر اس پر تبصرہ کرتے ہوئے جو کسر رہ گئی تھی وہ بھی بالکل ہی نکال دی ہے۔

علیزئی صاحب! ہاتھ باندھنا یا چھوڑنا اس میں اختلاف کی بات نہیں ہے۔ آپ شروع سے غیر متعلق دلائل ڈھونڈ ڈھونڈ کر نقل کر رہے ہیں، خیر تو ہے؟ حقیقت میں جناب کے پاس کوئی صحیح، صریح، مرفوع دلیل ہو تو پیش کریں لیکن وہ تو ہے نہیں پھر ایسا ہی کرنا ہے۔

جناب کا لکھا کہ "اگر دایاں ہاتھ پوری بائیں ذراع پر رکھا جائے تو خود بخود سینے پر آجاتا ہے" یہ پوری "ذراع" پر رکھنے کا جناب نے کہاں سے مطلب لے لیا اور یہ کس مُحدِّث نے شرح کی ہے۔ جب "ذراع" کے ساتھ "ید" کا لفظ استعمال ہو تو پھر ہاتھ گُٹ تک شمار ہوگا یعنی دائیں ہاتھ کو بائیں کلائی یعنی گٹ پر باندھا جائے، یا تو دائیں کلائی کو بائیں کلائی پر رکھنے کے لفظ ہوتے پھر جناب یہ طریقہ بیان کرتے تو کوئی اسے صحیح کہتا عقل مند محسوس ہوتا۔ "ذراع" اور "ید" کے الفاظ جدا جدا ہونے کی وجہ سے یہاں آپ کا مطلب ہرگز نہیں نکلتا۔

حدیث مبارکہ میں ذراع پر ذراع نہیں بلکہ ذراع پر ید (ہاتھ) رکھنے کا ذکر ہے ہاتھ تو پوری ذراع پر آنہیں سکتا کیونکہ اگر گٹ پر گٹ رکھ کر بھی جناب دیکھیں گے تو بھی ذراع کا کچھ حصہ ہاتھ سے باہر رہے گا اور اگر جناب کی بیان کردہ تعریف کے مطابق کہنی کے سرے پر ہاتھ کی

انگلیوں کے پورے رکھے جائیں تو ذراع پر ذراع آئے گی، نہ کہ ذراع پر ید، اور مذکورہ حدیث مبارکہ میں ذراع پر ذراع نہیں بلکہ ذراع پر ید کا ذکر ہے۔

آپ حضرات نہ جانے کس دلیل کے ساتھ بازو پر بازو رکھتے ہیں، یہ حدیث تو آپ کی دلیل ہرگز ہرگز نہیں بن سکی، بلکہ جناب نے اپنے ہمنوا مناظر طالب۔۔۔شاہ سے پوچھنا تھا کہ مری میں لامذہبوں کی جامع مسجد میں تقریباً تیس (٣٠) آدمیوں کی موجودگی میں (جس میں اکثریت لامذہبوں اور دیوبندیوں کی تھی) سجاد نامی لامذہب نے جناب کے استدلال جو جناب کے مناظر صاحب نے اسی طرح پیش کیا تھا اس کا تجرباتی طور پر کس شاندار طریقہ سے رد کیا تھا؟ اور شاہ جی کے ذراع پر ذراع رکھنے کو یہ کہہ کر کہ لوگوں کو ذراع پر ذراع نہیں، بلکہ ذراع پر ہاتھ رکھنے کا حکم دیا جاتا تھا اور ہاتھ باندھ کر دکھائے تھے اور کہا تھا کہ شاہ جی اس حدیث کے مطابق ہاتھ کو جب ذراع پر رکھیں گے تو ہاتھ زیر ناف آسانی سے جاتے ہیں نہ کہ سینہ پر۔

ثانیًا: علیزئی صاحب! یہ حدیث مبارکہ جو کہ آپ نے دلیل کے طور پر پیش کی ہے یہ صحیح بخاری کی حدیث مبارکہ ہے جیسا کہ جناب نے بھی حوالہ ذکر کیا اور صحیح بخاری کوئی ایسی کتاب نہیں کہ جس کو چودہ سو سال تک کسی نے نہ پڑھا ہو یا اس کی شرح نہ کی گئی ہو؟

بلکہ یہ وہ کتاب ہے جس کی تقریباً تمام کتب احادیث سے زیادہ شروحات ہیں۔ لیکن چودھویں صدی ہجری سے پہلے تو کسی نے اس حدیث مبارکہ سے یہ مطلب نہیں نکالا تھا جواب لامذہبوں نے نکالنا شروع کر دیا ہے، بلکہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ جیسے شارح نے بھی لکھا کہ: "

قوله: (على زراعه) أبهم موضعه من الذراع، وفي حديث وائل عند أبي داود والنسائي ثم وضع يده اليمنى على ظهر كفه اليسرى والرسغ من الساعد، وصححه ابن خزيمة وغيره، وأصله في صحيح مسلم بدون الزيادة، والرسغ

بضم الراء وسكون السين المهملة بعدها معجمة هو المفصل بين الساعد والكف.... (فتح البارى ٢/١٧٨، احياء التراث العربى)

آپ کے ایک مایہ ناز محقق یعنی ابوالحسن عبیداللہ بن محمد عبدالسلام المبارکپوری غیر مقلد اس حدیث بخاری کی شرح میں لکھتے ہیں:

"أبهم سهل بن سعد موضعه من الذراع.... والمراد انه وضع يده اليمنى بحيث صار وسط كفه اليمنى على الرسغ، ويلزم منه ان يكون بعضها على الكف اليسرى والبعض على الساعد... واعلم انه لم يروفى رواية وضع الذراع على الذراع، فما يفعله بعض العوام من وضع الذراع على الذراع بحيث انهم يضعون الكف اليمنى على مرفق اليد اليسرى او قريباً منه ثم ياخذونه باصابع اليد اليمنى هوهما لا اصل له ...

(المرعاة المفاتيح شرح مشكوة المصابيح ٢/٢٩٩، ٢٩٨)

سہل بن سعد نے بازو کے حصہ میں ابہام رکھا ہے۔ اور اس سے مراد یہ ہے کہ دائیں ہاتھ اس حیثیت سے رکھے کہ دائیں ہتھیلی بائیں گٹ کے اوپر آجائے اور لازم ہے کہ کچھ حصہ دائیں ہاتھ کا بائیں ہتھیلی پر اور کچھ حصہ بازو پر آئے۔ اور جاننا چاہئے کہ کسی روایت میں بھی یہ الفاظ مروی نہیں ہیں کہ بازو پر بازو باندھا جائے اور بعض (جاہل) عوام جو یہ کرتے ہیں کہ بازو پر بازو اس طرح رکھتے ہیں کہ دائیں ہتھیلی بائیں کہنی تک یا اس کے قریب پہنچ جائے پھر دائیں انگلیوں سے اس کو پکڑتے ہیں، یہ وہ عمل ہے جس کی کوئی اصل نہیں ہے۔

جناب علیزئی صاحب! غور کیجئے گا یہ آپ کے محدث صاحب کیا کہہ رہے ہیں، یہ طعنہ کس کو دیا جا رہا ہے، آپ سمجھ تو گئے ہوں گے۔۔۔؟ کہیں ان جاہلوں کے قائد اور پیشوا آپ ہی تو

نہیں ہیں؟۔

پس ثابت ہوا کہ بازو کو بازو پر نہیں باندھنا بلکہ دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو بائیں ہاتھ کے گٹ پر رکھنا ہے، اور اس طرح ہاتھ سینہ پر نہیں بلکہ آسانی کے ساتھ زیر ناف آتے ہیں، جو طریقہ الحمدللہ اہل سنت کا ہے۔

ثالثاً: علیزئی صاحب کا لکھنا کہ "سیدنا ہلب الطائی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "یضع هذه على صدره" آپ (ﷺ) یہ (ہاتھ) اپنے سینے پر رکھتے تھے۔

(مسند احمد ج ۵ ص ۲۲۶ وسندہ حسن)۔

اقول: جناب کا یہ لکھنا آپ کی بے بسی کا واضح آئینہ دار ہے کیونکہ لا مذہب اس مسئلہ میں کوئی صحیح، صریح، مرفوع حدیث پیش نہیں کر سکتے تبھی تو "وسنده حسن" لکھا۔

علیزئی صاحب! کیا سوال میں "حسن" روایت کا مطالبہ کیا گیا تھا جو آپ نے نقل کرنے کے بعد لکھا کہ "وسندہ حسن" اور اپنی طرف سے سوال کا جواب دے دیا۔ ہم مانتے ہیں کہ جناب ایڑی چوٹی کا زور لگانے کے باوجود اس مسئلہ پر بھی کوئی صحیح، صریح، مرفوع حدیث تلاش کرنے اور سوال کا جواب دینے سے قاصر ہیں تو کوئی بات نہیں تھی صاف لکھ دیتے کہ اس بارے میں بھی کوئی صحیح، صریح، مرفوع روایت تو ہمارے پاس نہیں، لیکن میں حسن کا سہارا لے کر اس کا جواب دینے لگا ہوں، مگر ستیاناس ہو خود غرضی اور خود پسندی کا جس نے جناب کو اس لئے اس سے باز رکھا کہ کہیں بھرم کھل نہ جائے۔

لیکن آیئے جناب کی نقل کردہ روایت کی سند و متن ہم نقل کرتے ہیں:

حدثنا عبد الله حدثني أبي ثنا يحيى بن سعيد عن سفيان حدثني سماك عن قبيصة بن هلب عن أبيه قال: رأيت النبي ﷺ ينصرف عن يمينه و عن يساره

و رأيته قال : يضع هذه على صدره ،وصف يحيى اليمنى على اليسرى فوق المفصل . . (مسند أحمد ۲۲۶/۵ (۲۲۰۱۷))

اولًا: جناب علیزئی صاحب! پہلے اپنی نقل کردہ دلیل کے الفاظ دیکھیں

"رأيت النبي ﷺ ينصرف عن يمينه وعن يساره "

لامذہب جی! کیا نماز میں کبھی دائیں اور بائیں پھرا جاتا ہے؟۔

جناب کی بیان کردہ روایت میں تو پہلے پھرنے کا ذکر ہے اور سینہ پر ہاتھ رکھنے کا ذکر بعد میں ہے جو ایک عام آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ یہ بات نماز کے بعد کی ہو رہی ہے تو جناب سوال یہ تو نہیں تھا کہ کیا آپ ﷺ نے اپنی زندگی مبارکہ میں یا بعد از نماز سینہ پر ہاتھ رکھے یا نہیں، سوال تو تھا کہ" کیا نبی اکرم ﷺ نے حکم فرمایا تھا کہ نماز میں ہاتھ سینہ پر باندھے جائیں یا آپ ﷺ نے خود نماز میں سینے پر ہاتھ باندھے تھے؟۔"

ہاں! اب جناب اگلی روایت کا سہارا لیں گے تو جناب ہم پہلے سے بتا دیں کہ اس میں سینہ پر ہاتھ رکھنے کا ذکر نہیں اور حضرت ہلب الطائی سے جتنی بھی مسند احمد میں اس بارے میں روایات ہیں ان میں سے اگر کسی میں سینہ پر ہاتھ رکھنے کا ذکر ہے تو" في الصلوة " کے الفاظ نہیں اور جس میں "في الصلوة" کے لفظ ہیں اس میں سینہ پر رکھنے کا ذکر نہیں۔ پس یہ روایت نماز میں سینہ پر ہاتھ باندھنے میں صریح نہیں ہے جو آپ کی دلیل بن سکے۔

ثانیا: پہلی روایت کے تحت علیزئی صاحب کا لکھنا کہ" اگر دایاں ہاتھ پوری بائیں ذراع پر رکھا جائے تو خود بخود سینے پر آجاتا ہے"۔ خود انہی کی پیش کردہ دلیل سے غلط ثابت ہو گیا کیونکہ اس میں" فوق المفصل "یعنی جوڑ کے اوپر" ہے۔

پس دونوں روایتوں میں سے ایک لامذہب کی تکذیب کرتی ہے کیونکہ وہ پہلی بیان کرنے کے

بعد اپنی مجتہدانہ صلاحیت سے بیان کر چکے ہیں کہ جب" اگر دایاں ہاتھ پوری ذراع پر رکھا جائے تو خود بخود سینے پر آجاتا ہے" جبکہ دوسری میں واضح موجود ہے کہ ذراع پر ذراع نہیں بلکہ ہاتھ کو جوڑ پر رکھنا ہے۔ پس جب ہاتھ گٹ پر باندھا جائے تو بآسانی زیر ناف یا ناف پر آتا ہے، سینہ پر نہیں اور سینہ پر رکھنے والوں کو نماز میں بھی اکڑنا پڑے گا تب سینہ پر آئیں گے، جبکہ اسلام میں تو عام حالات میں بھی اکڑنے سے منع کیا گیا ہے چہ جائیکہ اللہ کی بارگاہ میں حاضری کے وقت آکڑ خان بنتے پھرو۔

ثالثًا: اس روایت کی سند میں ایک راوی " قبيصه بن هلب " ہے، اس کے بارے میں حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"قبيصة بن هلب عن أبيه ، قال ابن المديني مجهول، لم يروعنه غير سماک ".
(ميزان الاعتدال ص ۳۸۴ ج ۳)

قبیصہ بن ہلب اپنے باپ سے روایت کرتا ہے، ابن المدینی نے کہا کہ یہ مجہول ہے، اس سے سوائے سماک کے کوئی روایت نہیں کرتا۔

اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ:"وقال النسائي : مجهول ". اور امام نسائی نے کہا کہ مجہول ہے۔ (تهذیب التهذیب ۳۵۰/۸)

مجہول کی روایت کے بارے میں علیزئی صاحب جناب من نے کئی مقامات پر لکھا ہے کہ: مجہول کی روایت ضعیف و مردود ہوتی ہے۔

رابعًا: اس روایت کی سند میں ایک اور راوی" سماک بن حرب" ہے، جس کے بارے میں حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:"روى ابن المبارک عن سفيان : أنه ضعيف. وقال جرير الضبي: أتيت سماكا فرأيته يبول قائما فرجعت ولم أسأله ، فقلت:

خرف ... كان شعبة يضعفه ... وقال أحمد : سماک مضطرب الحديث ...
وقال صالح جزرة : يضعف. وقال النسائي: اذا انفرد بأصل لم يكن بحجة ،
لأنه كان يلقن فيتلقن ... قال ابن عمار : كا ن يغلط ، ويختلفون في حديثه.
وقال العجلي :جا ئز الحديث ،كان الثوری يضعفه قليلا .وقال ابن المديني :
روا يته عن عكرمه مضطربة ...(ميزا ن الا عتدا ل ۲/ ۲۳۲. ۲۳۳)

عبداللہ بن مبارک سفیان سے روایت کرتے ہیں کہ سماک ضعیف ہے۔ جریر الضبی نے کہا کہ میں سماک کے پاس آیا تو میں نے دیکھا کہ وہ کھڑے ہوکر پیشاب کر رہا ہے، تو میں واپس چلا آیا اور اس سے سوال نہ کیا اور میں نے کہا کہ یہ بے عقل ہے۔ شعبہ اس کی تضعیف کرتے تھے اور امام احمد نے فرمایا کہ سماک مضطرب الحدیث ہے اور صالح جزرہ نے کہا کہ وہ ضعیف ہے۔ امام نسائی نے کہا کہ جب وہ منفرد ہو تو بالکل حجت نہیں ہے کیونکہ وہ تلقین قبول کرتا تھا۔ ابن عمار نے کہا کہ وہ غلطیاں کرتا تھا اور اس کی حدیث میں محدثین اختلاف کرتے ہیں، اور عجلی نے کہا کہ وہ جائز الحدیث ہے اور سفیان ثوری اس کو ضعیف کہتے تھے۔ ابن المدینی نے کہا کہ اس کی عکرمہ سے روایت مضطرب ہے۔

نوٹ:

علیزئی نے سماک بن حرب کی توثیق کے متعلق ایک مضمون بنام ''نصر الرب فی توثیق سماک بن حرب'' لکھا جس میں اس نے امام شعبہ، سفیان ثوری، صالح بن محمد بغدادی، ابن خراش، ابن حبان اور ابن المبارک رحمۃ اللہ علیہم کے اقوال کے بارے میں کہیں مردود، کہیں ثابت نہیں، کہیں محلِ نظر لکھا ہے، اور جریر بن عبدالحمید نے جو اسے کھڑے ہوئے پیشاب کرتے دیکھ کر اس سے روایت لینا ترک کر دیا تھا اس کے بارے میں لکھا کہ یہ کوئی جرح نہیں، اور محمد بن عبداللہ بن عمار

کی جرح کی سند کو تو صحیح تسلیم کیا لیکن ساتھ ہی لکھ مارا کہ یقولون کا فاعل نامعلوم ہے ملاحظہ ہو:
(مقالات ۱/ ۴۲۸ تا ۴۳۲)

اولاً: اس پر تفصیل ''ازاحة العيب بسيف الغيب'' میں اس کے حاشیہ میں بیان ہوگی، ان شاء اللہ العزیز۔

ثانیاً: علیزئی صاحب! نے اپنے اس مضمون میں سماک بن حرب کے بارے میں جن آئمہ کی جرح کو تسلیم کیا ہے ان میں امام احمد بن حنبل، یعقوب بن شیبہ (حیلہ حوالہ کرتے ہوئے)، عقیلی اور نسائی رحمۃ اللہ علیہم۔

علیزئی صاحب! ہم یہاں ایک اضافہ کرنے لگے ہیں برا محسوس مت کیجئے گا کیونکہ وہ جناب کا اپنا ہی بزرگ ہے جس کو لامذہب اپنا امام لکھتے ہیں، یہ وہی ہے جس کا نام محمد بن علی بن احمد بن سعید بن حزم اندلسی ہے، وہ اپنی کتاب ''المحلى بالآثار'' کی پہلی جلد کے صفحہ ۱۷۵ پر لکھتا ہے کہ: ''سماک ابن حرب وهو يقبل التلقين ،شهد عليه بذلک شعبة وغيره ...'' ،اور اسی جلد کے صفحہ ۲۰۶ پر یہی بات لکھنے کے بعد لکھتا ہے کہ: ''وهذه جرحة ظاهرة'' ۔اور اسی کتاب کی جلد ۵ صفحہ ۳۵۶ پر لکھتا ہے کہ: ''وسماک ضعيف يقبل التلقين ،شهد به عليه شعبة، وغيره ۔اور اسی کتاب کی جلد ۶ صفحہ ۱۸۱ پر لکھتا ہے کہ: ''وسماک يقبل التلقين شهد عليه بذلک شعبة ،وغيره '' ۔اور اسی جلد کے صفحہ ۱۸۶ پر لکھتا ہے کہ: ''وسماک ضعيف '' ۔اور اسی جلد کے صفحہ ۳۰۵ پر لکھتا ہے کہ: ''سماک ضعيف يقبل التلقين'' ۔

علیزئی صاحب! آپ کے اس بزرگ و امام نے تو اس مسئلہ میں لامذہبوں کا جنازہ نکال دیا ہے کیونکہ یہ تو بغیر کسی اور جرح کے صرف تلقین قبول کرنے کی وجہ سے ہی اس کو ضعیف

قرار دے رہا ہے، اور بغیر کسی اور کی جرح کے صرف اس ایک جرح کو ہی ظاہر و واضح لکھنے کے ساتھ ساتھ اس کی روایات کو بھی ضعیف قرار دے رہا ہے۔

ہاں! ذہن میں رہے کہ جس جرح کی وجہ سے جناب کا بزرگ اس کی روایات کو ضعیف کہہ رہا ہے، جناب بھی اس کو تسلیم کر چکے ہیں کیونکہ یہ جرح کرنے والے صرف امام شعبہ ہی نہیں جس کو جناب کے بزرگ نے لکھا ہے بلکہ یہی جرح امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کی ہے اور وہ امام نسائی کی کتب میں موجود ہے۔

ایک اور بات کی طرف جناب کی توجہ مبذول کرواتے چلیں، جناب نے امام نسائی سے " ليس بالقوي و كان يقبل التلقين " اور "فاذا انفرد بأصل لم يكن حجة " علیحدہ علیحدہ مقامات سے نقل کر کے جو دھوکہ دینے کی کوشش کی ہے وہ کارگر ثابت نہیں ہوگی کیونکہ امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ اس کی ایک روایت کو اپنی ''سنن کبریٰ'' میں روایت کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

" فيه فسماك بن حرب ليس ممن يعتمد عليه اذا انفرد بالحديث لأنه يقبل التلقين .

(السنن الكبرى ٢/٢٥١ ، وفي نسخة ١/٥١٣)

امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے دوسری جگہ پر اس بات کو واضح کر دیا کہ اس کی حالت ایسی ہے کہ اکیلے ہوتے ہوئے یہ اعتماد کے قابل بھی نہیں ہے، اور جناب کی نقل کردہ روایت میں اس کا کوئی متابع نہیں ہے کہ یہ اعتماد کے لائق ہو سکے۔

ثالثا: امام خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ

"اذا عدل جماعة رجلا وجرحه أقل عددا من المعدلين فان الذي عليه جمهور العلماء ان الحكم للجرح والعمل به أولى ، وقالت طائفة بل الحكم للعدالة ،

وهذا خطاء.

(الكفاية في علم الرواية ١٣٤ ،ولسان الميزان لابن حجر ١/٢١١ ، وجمع الجوامع للسبكي ٢/١٦٤)

جب پوری ایک جماعت ایک شخص کی تعدیل کرے اور تھوڑے سے لوگ اس پر جرح کریں یعنی جرح کرنے والے بنسبت تعدیل کرنے والوں کے کم ہوں تو جمہور علماء کے نزدیک جرح راجح ہوگی اور اس پر عمل اولیٰ ہوگا، ایک گروہ نے کہا کہ تعدیل راجح ہوگی اور یہ غلط ہے۔

اور وہی امام ابن الصلاح الشہرزوری جن سے جناب نے سماک بن حرب سے اختلاط کی جرح اٹھانے کے لئے تائید حاصل کی ہے وہی لکھتے ہیں کہ:

" اذا اجتمع في شخص جرح و تعديل ، فالجرح مقدم لأن المعدل يخبر عما ظهر من حاله والجارح يخبر عن باطن خفي على المعدل . فان كان عدد المعدلين أكثر فقد قيل التعديل أولى . والصحيح والذي عليه الجمهور أن الجرح أولى لما ذكرناه ، والله أعلم .

(مقدمة ابن الصلاح ٥٢)

پس ثابت ہوا کہ جرح تعدیل پر مقدم ہوگی اگر چہ جرح کرنے والے تعداد میں تعدیل کرنے والوں سے کم ہی کیوں نہ ہوں۔

لہٰذا ثابت ہوا کہ علیزئی کی بیان کردہ روایت اول تو صریح نہیں، دوم صحیح نہیں، تو ہمارا سوال اپنی جگہ قائم ہے جس کا جواب علیزئی نہ تو دے سکا اور نہ ہی دے سکتا ہے۔

نوٹ: راقم الحروف نے قبلہ محدث کبیر حضرت علامہ مولانا مفتی محمد عباس رضوی صاحب مدظلہ العالی کے تحریری مناظرے بنام ''مناظرے ہی مناظرے'' کافی عرصہ پہلے ترتیب دیئے جو شائع کئے گئے اور دوبار میرے بیرون ممالک دوروں کے درمیان مکتبہ جمال کرم نے اسی پہلی مطبوع کاپی کو شائع کر دیا۔ ان میں راقم

همارا سوال نمبر (۷)

کیا نبی اکرم ﷺ نے نماز میں دایاں ہاتھ بائیں کہنی پر رکھا تھا؟

جواب علیزئی لا مذہب :

سیدنا وائل بن حجر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ''ثم وضع یدہ الیمنی علی ظهر کف الیسری والرسغ والساعد'' پھر آپ (ﷺ) نے اپنا دایاں ہاتھ اپنی بائیں ہتھیلی کی پشت اور رسغ (کلائی) اور ساعد (کہنی سے ہتھیلی تک کا حصہ/ القاموس الوحید ص ۷۶۹) پر رکھا تھا۔ (سنن ابی داود، الصلوۃ، باب رفع الیدین فی الصلوۃ ح ۷۲۷ وسندہ صحیح)۔

اقول :

اولاً : علیزئی جی! کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے ہم علی الاعلان یہ کہتے ہیں کہ باقی تو آپ میں کوئی

= =الحروف نے وضاحت کردی تھی کہ ان کو آپ کی عدم موجودگی میں شائع کیا گیا ہے اور ان پر آپ کی نظر ثانی بھی نہیں کروائی جاسکی، لہٰذا ان میں غلطی کا امکان موجود ہے جو کہ مطبوع کے صفحہ ۱۵۸ پر ضروری نوٹ کی سرخی کے ساتھ موجود ہے۔ مناظرے ہی مناظرے میں راقم الحروف کی غلطی سے سماک بن حرب کے بارے میں لکھا گیا تھا کہ وہ مدلس ہے جو نظر ثانی نہ ہونے کی وجہ سے شائع ہوگیا، جس پر علیزئی نے لکھا کہ یہ جھوٹ ہے ، یہ درست ہے کہ اس کو آئمہ محدثین نے مدلسین میں ذکر نہیں کیا لیکن یہ ارسال کرتا تھا اور علیزئی خود اپنی کتاب '' الفتح المبین في تحقیق طبقات المدلسین ص ۲۴ '' پر لکھتا ہے کہ: ''فالتدلیس والارسال شيء واحد عند الذهبی وهذا اصطلاح خاص له''. اور ص ۳۴ پر لکھا کہ: '' وهذا یدل علی أن التدلیس والارسال عند الامام ابن حبان شیء واحد''۔

پس علیزئی بتائے کہ اس کے نزدیک امام ابن حبان اور ذہبی وغیرہما محدثین جو ارسال اور تدلیس کو ایک ہی چیز تسلیم کرتے ہیں کیا وہ جھوٹے ہیں؟۔

آخر میں ہم پھر یہ ذکر کرتے چلیں کہ سماک بن حرب کے بارے میں مدلس لکھا جانا خطا و غلطی ہے، مگر مذکورہ روایت سماک بن حرب کی تدلیس کے علاوہ دوسری علتوں کی وجہ سے صحیح ثابت نہیں ہوسکتی۔

کمال ہے یا نہیں، لیکن نظری اور عقلی دھوکہ دینے میں آپ صاحبِ کمال ہیں، بلکہ اہل کمال سے بھی چار ہاتھ آگے نکل چکے ہیں۔

علیزئی صاحب! آپ نے تو لامذہبوں کو ایسی عجیب و غریب مخلوق بنا دیا ہے جس کا وجود شاید ہی دنیا کے کسی کونے کھدرے میں پایا جاتا ہو۔ جناب وہ کون سے علاقہ کے مکین ہیں جن کا دایاں ہاتھ ہتھیلی کی پشت پر بھی آتا ہو اور اس کے ساتھ ساتھ کہنی تک بھی پہنچ جاتا ہو؟۔

ثانیا : جناب نے '' رسغ '' کا معنی کلائی کیا ہے، جبکہ عربی اردو کی مشہور و معروف لغت '' المنجد ۲۹۰ '' میں ہے '' الرسغ والرسغ : گٹا۔ پہنچا۔ ج ارساغ و ارسغ۔

اور عربی زبان کی مشہور و معروف لغت '' لسان العرب ۴۲۸/۸ '' میں ہے

''[رسغ] مفصل ما بین الساعد والکف والساق والقدم ...

اور ابن الاثیر الجزری '' النهایة في غریب الحدیث والأثر '' میں لکھتے ہیں کہ [ان کمه کان الی رصغه] هي لغة في الرسغ وهو مفصل ما بین الکف [رصغ] والساعد. (النهایة ۲/۵۵۲)

اور ابوعبدالرحمٰن الفراهیدي '' کتاب العین ۴/۳۷۷ '' میں لکھتے ہیں

''الرسغ : مفصل ما بین الساعد والکف والساق والقدم .

پس معلوم ہوا کہ '' رسغ '' کا صحیح معنی ہاتھ اور بازو کے درمیان والا جوڑ ہے نہ کہ کلائی، جیسا کہ علیزئی نے اپنا مطلب حاصل کرنے کے لئے '' القاموس الوحید '' کے حوالہ سے لکھا۔

جناب! یہ حدیث مبارکہ سینہ پر ہاتھ باندھنے کی تائید نہیں کرتی اور نہ ہی اس حدیث سے کلائی پر کلائی رکھنا ثابت ہوتا ہے، جب دایاں ہاتھ بائیں ہتھیلی کی پشت پر رکھیں تو کہنی تک ہاتھ کا پہنچنا مشکل نہیں بلکہ ناممکن ہے [سوائے اس کے کہ کوئی لامذہب عجیب و غریب قسم کی مخلوق ہے]۔

بالفرض محال جناب کا کیا ہوا ترجمہ ہی منظور کر لیا جائے تب بھی دایاں ہاتھ کہنی پر نہیں آئے گا کیونکہ جب دایاں ہاتھ بائیں ہتھیلی کی پشت پر بھی رکھنا ہے تو کبھی بھی کہنی تک نہیں پہنچ سکتا اور اگر دائیں ہاتھ کی انگلیوں کے پورے کہنی تک پہنچا کر رکھیں جائیں تو بائیں ہاتھ کی ہتھیلی کی پشت پر نہیں ہوسکتا، پھر دایاں ہاتھ نہیں بلکہ ذراع پر ذراع ہوگی، جب کہ حدیث مبارکہ میں ہاتھ کا ذکر ہے، اگر سمجھ نہ آئے تو تجربہ کر کے دیکھ سکتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جناب کے ایک نامور محدث ابوالحسن عبید اللہ بن محمد عبد السلام مبارک پوری صاحب حضرت سہل بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صحیح بخاری والی روایت کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:" **ابهم سهل بن سعد موضعه من الذراع.... والمراد انه وضع يده اليمنى بحيث صار وسط كفه اليمنى على الرسغ ، ويلزم منه ان يكون بعضها على الكف اليسرى والبعض على الساعد ... واعلم انه لم يرو في رواية وضع الذراع على الذراع ، فما يفعله بعض العوام من وضع الذراع على الذراع بحيث انهم يضعون الكف اليمنى على مرفق اليد اليسرى او قريباً منه ثم ياخذونه باصابع اليد اليمنى هوهما لا اصل له ...**

(المرعاة المفاتيح شرح مشكوة المصابيح ۲/۲۹۹، ۲۹۸)

سہل بن سعد نے بازو کے حصہ میں ابہام رکھا ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ دائیں ہاتھ اس حیثیت سے رکھے کہ دائیں ہتھیلی بائیں گٹ کے اوپر آجائے، اور لازم ہے کہ کچھ حصہ دائیں ہاتھ کا بائیں ہتھیلی پر اور کچھ حصہ بازو پر آئے۔ اور جاننا چاہیے۔ کہ کسی روایت میں بھی یہ الفاظ مروی نہیں ہیں کہ بازو پر بازو باندھا جائے، اور بعض (جاہل) عوام جو یہ کرتے ہیں کہ بازو پر بازو اس طرح رکھتے ہیں کہ دائیں ہتھیلی بائیں کہنی تک یا اس کے قریب پہنچ جائے پھر دائیں

انگلیوں سے اس کو پکڑتے ہیں، یہ وہ عمل ہے جس کی کوئی اصل نہیں ہے۔

کیوں جناب علیزئی صاحب! اب بتائیں کہ آپ نے اپنے ترجمہ میں جو ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے وہ کہاں سے اخذ کیا ہے؟۔

کہیں دانستہ طور پر حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں معنوی تحریف کا ارادہ تو نہیں؟ خدارا انصاف چاہئے! جہلاء کے پیچھے لگ کر احادیثِ رسول ﷺ کا حلیہ نہیں بگاڑنا چاہئے، مذکورہ حوالہ کو بار بار پڑھیں۔

ع — شائد کہ اتر جائے تیرے دل میں میری بات

پس ثابت ہوگیا کہ علیزئی صاحب اس مسئلہ میں بھی اپنے دوسرے لامذہبوں کی طرح علمی یتیم ہی ہیں اس کی کوئی دلیل نہ ان کے پاس ہے اور نہ ہی کسی اور لامذہب کے پاس، اور نہ ہی ان شاء اللہ قیامت تک کوئی پیش کرسکتے ہیں۔

ہمارا سوال نمبر (۸)

ایک صحیح، صریح، مرفوع حدیث پیش کریں کہ آپ ﷺ نے پورا سال تہجد کی اذان کا حکم فرمایا ہو؟ وہ اذان رمضان شریف میں سحری کھانے کے لئے نہ ہو بلکہ پورا سال تہجد پڑھنے کے لئے ہو؟

جواب علیزئی لا مذہب:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((**ان بلالا يؤذن بليل فكلوا واشربوا حتى أؤذن ابن أم مكتوم.**)) بے شک بلال رات کو اذان دیتے ہیں لہذا کھاؤ اور پیو حتی کہ ابن ام مکتوم اذان دیں۔ (صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب الاذان قبل الفجر ح ۶۲۲، ۶۲۳) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ طلوع فجر سے پہلے رات کی اذان دینا جائز ہے، اگر کوئی شخص اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے سارا سال رات کی اذان دے تو جائز ہے اور دوسرے دلائل کی رو سے

اگر یہ اذان نہ بھی دے اور صرف صبح کی اذان دے تو بھی جائز ہے۔

اقول:

اولاً: واہ رے لامذہب جی! جناب کا یہ جواب دیکھ کر لگتا ہے کہ جس کسی نے بھی ''ڈوبتے کو تنکے کا سہارا'' کہاوت کہی تھی وہ شاید جناب جیسے لامذہبوں سے کچھ عقل مندوں کے لئے ہوگی، علیزئی صاحب! کیا سوال میں نہ جناب کو اور نہ ہی جناب کے ہم نشینوں کو نظر آیا کہ: ''وہ اذان رمضان شریف میں سحری کھانے کے لئے نہ ہو''۔

مگر جس بات کی نفی کا ذکر سوال میں کیا گیا تھا یعنی وہ اذان رمضان میں سحری کھانے کے لئے نہ ہو، اسی بات کو بیان کرنے والی روایت نقل کر دی، شاید اس کی وجہ یہی ہے کہ جناب نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ، بس دیکھا کہ دو اذانوں کا ذکر ہے لہذا اسے لکھ دو اور واویلا شروع کر دو کہ ہم نے جواب دے دیا۔

لامذہبوں کے محقق و محدث صاحب! لگتا ہے جناب کو صحیح بخاری و مسلم میں ان اذانوں کے درمیان وقت والی روایت آج تک نظر نہیں آئی؟ یا پھر شاید جناب نے مسلک کے بچاؤ کی مہم کا سبق پڑھا ہوا ہے کہ جو بھی ہو ہر سمت سے نظریں بند کرو اور مسلک کو بچاؤ، لیکن اتنا خیال رہے کہ یہ مسلک بچاؤ مہم کا سبق آپ لوگوں کو حقائق بدلنے پر مجبور کرتا رہے گا اور آخر کار یہی حقائق سے نظریں چرانا آپ میں ناعاقبت اندیشی پیدا کر دے گا اور انجام کار۔۔۔۔

آیئے! جناب کی تسلی کے لئے ان دونوں اذانوں میں وقت کا فرق ہم دکھا دیتے ہیں، ملاحظہ ہو:

نافع حضرت ابن عمر اور قاسم بن محمد حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالی عنہا سے روایت کرتے ہیں

'' ان بلالا کان یؤذن بلیل فقال رسول اللہ ﷺ کلوا واشربوا حتی یؤذن ابن أم مکتوم فانه لا یؤذن حتی یطلع الفجر قال القاسم ولم یکن بین اذانهما الا ان

یرقی ذا وینزل ذا''. (صحیح بخاری، کتاب الصوم، ۱/۲۵۷)

''کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالی عنہ رات رہے سے اذان دے دیا کرتے تھے تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا تم کھاتے پیتے رہا کرو یہاں تک کہ عبداللہ بن ام مکتوم اذان دے، وہ اس وقت اذان نہیں دیتے جب تک صبح نہیں ہوتی، قاسم نے کہا بلال رضی اللہ عنہ اور ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ دونوں کی اذان میں اتنا ہی فرق ہوتا ہے کہ ایک اترتا اور ایک چڑھتا''۔ [ترجمہ وحید الزمان]

علیزئی صاحب! آیئے جناب کی ہی جماعت کے ایک رسالہ سے اس کا جواب آپ کے سامنے رکھتے ہیں کہ یہ اذان تہجد کے لئے نہیں، بلکہ فجر کے لئے ہی ہوتی تھی اور اسی کو آپ کی جماعت والوں نے صحیح کہا ہے ''اہلحدیث لاہور'' والوں کے حوالے سے ''فتاوے علمائے حدیث'' والے نے لکھا کہ:

''سوال: رمضان المبارک میں جو سحری کی اذان کہی جاتی ہے اس کا ثبوت کیا ہے؟۔۔۔قرآن وسنت کی روشنی میں تحریر فرمادیں۔

الجواب: نبی ﷺ کے دو موذن تھے، حضرت بلال اور ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہما، حضرت بلال رضی اللہ تعالی عنہ کی اذان کے متعلق علماء کے درمیان اختلاف ہے کہ آیا وہ سحری کے لئے یا فجر کے لئے؟ صحیح بات یہی ہے کہ وہ فجر کے لئے تھی۔۔۔۔اہلحدیث لاہور جلدا شمارہ ۴۷۔

(فتاوے علمائے حدیث ۲/۱۶۷)

ثانیا: امام ابوالحسن بن محمد الحافظ ابن القطان الفاسی م ۶۲۸ھ فرماتے ہیں: **'' والحدیث المذکور لا یعارضه لأنه في رمضان خاصة اما سائر العام فما کان یؤذن الا بعد الفجر.** (بیان الوهم والایهام الواقعین في کتاب الاحکام لابن القطان ۳/۲۷۴)

اور حدیث مذکور اس حدیث کے متعارض نہیں کیونکہ یہ اذان رمضان کے ساتھ خاص ہے اور تمام

سال اذان طلوعِ فجر کے بعد ہی ہوتی تھی۔

اگر یہ تہجد کے لئے ہو جیسا کہ لامذہبوں میں سے چند کا دعوی ہے تو پھر یہ اذان ہی ایک ایسی اذان ہو گی جو نماز کا وقت ختم ہونے پر دی جائے۔

امام ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ:

"وفي اجماع المسلمين على أن النافلة لا أذان لها ما دل على أن أذان بلال بالليل انما كان لصلاة الصبح ،والله أعلم .(الاستذكار ١/٤٥٠، ٤٥١)

اسی بات کو علامہ عراقی رحمۃ اللہ علیہ مندرجہ ذیل الفاظ میں نقل فرماتے ہیں کہ:

"قال ابن عبد البر : وفي اجماع المسلمين على أن النافلة بالليل والنهار لا أذان لها ما يدل على أن أذان بلال بالليل انما كان لصلاة الصبح .

(طرح التثريب لأبي زرعة العراقي ٢/٢٠٧)

امام ابن عبدالبر نے فرمایا کہ اس پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے کہ نفلی نمازیں چاہے دن کی ہوں یا رات کی ان کے لئے اذان نہیں، تو یہ دلالت کرتا ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالی عنہ کی اذان رات کو صبح کی نماز کے لئے تھی۔

علامہ عراقی مزید فرماتے ہیں:

"فيحصل الجمع بين الحديثين بحمل أحدهما على رمضان والآخر على غيره . (طرح التثريب لأبي زرعة العراقي ٢/٢١٠)

ان دونوں حدیثوں کے درمیان تطبیق (جمع) اس طرح ہو سکتی ہے کہ ایک اذان رمضان شریف میں اور دوسری سارا سال۔

اسی صحیح بخاری کی روایت کی شرح میں ابن بطال رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ:

"وفي اجماع المسلمين على أن النافلة بالليل والنهار لا أذان لها دليل بين أن أذنه كان لصلاة الصبح .(شرح صحيح البخارى لابن بطال ٢/٣١٦)

آئیے! آخر میں پھر آپ ہی کے گھر کی شہادت پیش کر دیں۔

مولوی ابوالبرکات لامذہب کا فتوی:

سوال: بعض مساجد میں تہجد کی اذان ہوتی ہے ہم ان سے کہتے ہیں کہ یہ قرآن و حدیث سے ثابت نہیں ہے وہ یہ استدلال پیش کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ جب حضرت بلالؓ اذان کہیں تو تم کھاؤ پیو اور جب عبداللہ بن ام مکتوم اذان کہیں تو تم کھانے پینے سے رک جاؤ اس میں وقت کی تعین نہیں ہے لہذا اسے تہجد کی اذان کہنا درست ہے۔ (محمد حسین جنڈیالہ باغوالہ)

جواب: "اس حدیث سے استدلال غلط ہے کیونکہ بلال کی اذان فجر کی تھی کیونکہ فجر کے وقت نیند کا غلبہ ہوتا ہے اس لئے فجر سے چند منٹ پہلے بلال کی اذان ہوتی تھی اگر یہ اذان سحری یا تہجد کی ہوتی تو فجر سے تقریباً گھنٹہ پہلے ہونی چاہیے تھی، لیکن ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے بخاری مسلم وغیرہ کتب احادیث میں روایت موجود ہے کہ عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا فرماتی ہیں کہ دونوں اذانوں کے درمیان صرف اتنا فرق تھا کہ بلالؓ اذان کہہ کر اترتے تھے اور حضرت عبداللہ بن ام مکتومؓ اوپر چڑھ کر اذان کہہ دیتے تھے اتنے فاصلے میں تہجد کیا پڑھی جاتی ہے اور سحری کا کھانا کیسے کھایا جاتا ہے۔

کسی محدث نے آج تک کتب احادیث میں تہجد یا سحری کی اذان کا باب نہیں باندھا معلوم ہوا کہ اس قسم کی اذان شریعت میں ہے ہی نہیں۔۔۔۔ (فتاوی برکاتیہ ص ۲۳-۲۴)

جس سے معلوم ہوا کہ یہ اذان بہرحال تہجد کے لئے نہ تھی۔ باقی رہی یہ بات کہ یہ پورا سال چلتی تھی، تو ایسی روایت اگر کوئی ہے تو اس کو پیش کیا جانا چاہیے تھا۔

مذکورہ حدیث میں سحری کا ذکر ہے اور سحری مشہور تو رمضان شریف میں ہی ہے جو کہ پورے اہتمام سے ہوتی ہے نہ کہ نفلی روزوں کی کیونکہ نفلی روزوں کی سحری کا اتنا اہتمام نہیں کیا جاتا۔

جہاں بھی دو اذانوں کا ذکر ہے وہاں سحری کا ذکر بھی ضرور ہے اور اگر بغیر سحری کے ذکر کے کوئی باسند صحیح حدیث ہے تو لامذہبوں کو چاہیے کہ وہ پیش کریں۔

علیزئی صاحب! ہمارا سوال جوں کا توں ابھی تک باقی ہے، نہ آپ اس کے جواب میں کوئی دلیل پیش کر سکے اور نہ قیامت تک کر سکتے ہیں ان شاء اللہ العزیز۔

ہمارا سوال نمبر (۹)

ایک صحیح صریح مرفوع حدیث پیش کریں کہ نبی اکرم ﷺ نے نمازِ باجماعت میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بلند آواز سے پڑھنے کا حکم فرمایا ہو یا خود پڑھی ہو؟۔

جواب علیزئی لا مذہب:

علیزئی صاحب نے نعیم المجمر والی روایت کو ذکر کیا جس کا جواب ''ڈھول کا پول'' میں آرہا ہے۔

آگے علیزئی صاحب لکھتے ہیں ''یاد رہے کہ بسم اللہ الخ نماز میں سراً بھی جائز ہے بلکہ بہتر ہے''۔

اقول:

جناب علیزئی صاحب! اگر سرًا پڑھنا بہتر ہے تو جناب کے ہم مسلک کیوں بلند آواز سے پڑھتے ہیں؟ لامذہب لوگ نماز میں جو بہتر نہیں اس عمل کو کیا سمجھ کر عمل کرتے ہیں؟۔ یہ عقدہ بھی حل کر دیں۔

آگے علیزئی صاحب نے لکھا کہ: رسول اللہ ﷺ نے اپنی اور خلفائے راشدین کی سنت پر عمل کرنے کا حکم دیا ہے دیکھئے سنن الترمذی (۲/۹۶ ح ۲۶۷۶ وقال: ''ھذا حدیث حسن صحیح'' وسندہ صحیح)

جناب علیزئی صاحب! آج تک تو آپ کے بڑے لکھتے رہے کہ ''صحابہ کا قول وفعل حجت نہیں'' جناب ان سے بغاوت پر اُتر آئے؟

لیکن ایسا نہیں کیونکہ یہ بات صرف مقصد کے حصول کے لئے ہے، ورنہ خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی اور بالخصوص حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اور بھی کئی سنتیں ہیں جن کو تسلیم کرنے کے لئے جناب بھی تیار نہیں ہوں گے۔

آگے علیزئی کا لکھنا کہ ''اور خلفائے راشدین میں سے سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پیچھے عبد الرحمٰن بن أبزی نے نماز پڑھی '' **فجهر ببسم الله الرحمن الرحيم** ''تو انہوں نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم جہراً پڑھی۔ (شرح معانی الآثار للطحاوی ۱/۱۳۷، وسندہ صحیح، مصنف ابن ابی شیبہ ۱/۴۱۲ ح ۴۷۵۷، السنن الکبریٰ للبیہقی ۲/۴۸)

اقول: سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فعل مرفوع حدیث نہیں، ہم نے سوالات میں صحیح، صریح، مرفوع کا ذکر کیا ہے، یہ مرفوع نہ ہونے کی وجہ سے ہمارے سوال کا جواب نہیں۔ ویسے جناب کو اسے پیش کرتے ہوئے اپنے بزرگوں کے اقوال کو پیش نظر رکھنا چاہئے تھا۔

پس ہمارا سوال ابھی تک قائم ہے کیونکہ علیزئی ایک بھی روایت صحیح، صریح، مرفوع اور غیر محتمل پیش نہیں کر سکا۔

ہمارا سوال نمبر (۱۰)

''ایک صحیح، صریح، مرفوع حدیث پیش کریں کہ نبی اکرم ﷺ نے وفات تک رفع الیدین عند الرکوع وبعد الرکوع کیا تھا؟''

جواب علیزئی لا مذہب:

صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ رکوع سے پہلے اور رکوع کے بعد رفع الیدین کرتے

تھے۔ مثلاً دیکھئے صحیح بخاری (کتاب الاذان ، باب رفع الیدین اذا کبر واذا رکع واذا رفع ح ۷۳۶)

اس حدیث کے راوی سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی رکوع سے پہلے اور رکوع کے بعد رفع یدین کرتے تھے۔ (دیکھئے صحیح بخاری: ۷۳۹ وسندہ صحیح)

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ سے رفع یدین کی حدیث کے راوی، ان کے جلیل القدر صاحبزادے امام سالم بن عبداللہ بن عمر رحمہ اللہ بھی رکوع سے پہلے اور رکوع کے بعد رفع یدین کرتے تھے۔

(حدیث السراج ج ۲ ص ۳۴، ۳۵ ح ۱۱۵، وسندہ صحیح)

معلوم ہوا کہ رفع الیدین عند الرکوع و بعد الرکوع پر عمل عہد نبوت، عہد صحابہ اور عہد تابعین میں مسلسل رہا ہے لہذا رفع یدین منسوخ یا متروک ہونے کا دعویٰ باطل ہے۔

رسول اللہ ﷺ سے رفع الیدین عند الرکوع و بعد الرکوع کا ترک یا منسوخ ہونا کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے لہذا یہ خود بخود ثابت ہو گیا کہ نبی اکرم ﷺ وفات تک رفع یدین کرتے تھے

یہ مسئلہ سمجھانے کے لئے ایک مثال پیش خدمت ہے:

رسول اللہ ﷺ سے نماز میں ہاتھ باندھنا ثابت ہے اور ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھنا بالکل ثابت نہیں ہے لہذا یہ خود بخود ثابت ہو گیا کہ نبی اکرم ﷺ وفات تک نماز میں ہاتھ باندھتے تھے۔

اقول:

علیزئی صاحب! ایسے ویسے کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے اگر کوئی ایک ہی دلیل جناب کے پاس موجود ہے جو کہ مرفوع، صحیح اور صریح ہو اور اس میں وفات تک کا ذکر ہو بیان کریں، لیکن وہ آپ کر نہیں سکتے۔

جناب اپنے گھر بیٹھے جو چاہے لکھتے رہیں کہ: ''رفع یدین منسوخ یا متروک ہونے کا دعویٰ باطل

ہے'' لکھنے سے تو باطل نہیں ہو جائے گا، باطل قرار دینے کے لئے ثبوت درکار ہوتے ہیں جو آج تک کوئی لا مذہب بھی پیش نہیں کر سکا اور نہ ہی کر سکتا ہے۔

اگر ہمارے سوال کے مطابق جناب کے پاس کوئی دلیل ہے تو پیش کریں مگر وہ جناب تا حیات پیش نہیں کر سکیں گے، ان شاء اللہ العزیز۔

ہمارا سوال نمبر (۱۱)

ایک صحیح، صریح، مرفوع، غیر محتمل حدیث پیش کریں کہ کپڑا ہوتے ہوئے ننگے سر نماز پڑھنے کا حکم حدیث میں ہو؟۔

جواب علیزئی لا مذہب:

اگر کپڑا ہو تو سر ڈھانپ کر نماز پڑھنی چاہئے اور یہی بہتر ہے۔ دیکھئے میری کتاب ہدیۃ المسلمین (حدیث نمبر: ۱۰) اور ماہنامہ الحدیث حضرو: ۳۱ ص ۵۱)۔

اقول:

علیزئی صاحب! آپ نے مذکورہ بالا عبارت لکھ کر اس بات کو خود ہی تسلیم کر لیا ہے کہ کپڑا ہوتے ہوئے ننگے سر نماز نہیں پڑھنی چاہئے کیونکہ یہ بہتر نہیں، بلکہ بہتر یہ ہے کہ سر ڈھانپ کر نماز پڑھی جائے۔

آگے لکھا ہے کہ ''اگر کپڑا نہ ہو تو مرد کی نماز ننگے سر جائز ہے''

اقول: ہمارے سوال میں کپڑا نہ ہونے کا نہیں بلکہ کپڑا ہوتے ہوئے کا ذکر ہے۔

آگے علیزئی نے بھی ایک کپڑے میں نماز پڑھنے والی حدیث لکھی ہے جس کے بارے میں ''ڈھول کا پول'' میں تفصیل آ رہی ہے۔

یہاں پر صرف مختصر عبارت عبدالجبار غزنوی، اور محمد داؤد غزنوی کے حوالہ سے لکھی جاتی ہے جو کہ

ان لا مذہبوں کے لئے قابل غور ہے جو لا مذہبوں کی اس بارے میں وکالت کرتے ہیں:

''۔۔۔ابتداء عہد اسلام کو چھوڑ کر جبکہ کپڑوں کی قلت تھی ، اس کے بعد اس عاجز کی نظر سے کوئی ایسی روایت نہیں گزری جس میں بہ صراحت یہ مذکور ہو کہ نبی ﷺ نے یا صحابہ کرام نے مسجد میں اور وہ بھی نماز با جماعت میں ننگے سر نماز پڑھی ہو۔ چہ جائیکہ معمول بنالیا ہو۔ اس لئے اس بدرسم کو جو پھیل رہی ہے بند کرنا چاہیئے اگر فیشن کی وجہ سے ننگے سر نماز پڑھی جائے تو نماز مکروہ ہوگی۔ اگر تعبد اور خضوع اور خشوع و عاجزی کے خیال سے پڑھی جائے تو یہ نصارٰے کے ساتھ تشبہ ہوگا۔ اسلام میں ننگے سر رہنا سوائے احرام کے، تعبد یا خشوع وخضوع کی علامت نہیں اور اگر کسل اور سستی کی وجہ سے ہے تو یہ منافقوں کی ایک خلقت سے تشابہ ہوگا۔ ولا یاتون الا وھم کسالی (نماز کو آتے ہیں تو سست اور کاہل ہو کر) غرض ہر لحاظ سے یہ ناپسندیدہ عمل ہے۔

(الاعتصام جلد ۱۱ ش ۱۸ بحوالہ فتاوے علمائے حدیث ۳/۲۹۱)

پس اب علیزئی اور اس مسئلہ میں اس کے ہمنوا اپنے ہی بزرگوں سے پوچھیں کہ ہم جو اس پر دلائل تلاش کر کر کے لوگوں کو فراہم کرنے میں لگے ہوئے ہیں اور اسی عہد اول سے تعلق رکھنے والی روایات کا سہارا لے کر اس مسئلہ میں جواز فراہم کر رہے ہیں، ہم کس کھاتے میں ہوئے؟۔۔۔

اور بالخصوص وہ لا مذہب مولوی یا عوام جو کپڑا ہونے کے باوجود جب نماز پڑھنے یا پڑھانے لگتے ہیں تو سر پر لیا ہوا بھی اُتار کر آگے رکھ لیتے ہیں، کن میں شامل ہیں؟۔

ہمارا سوال نمبر (۱۲)

''ایک صحیح، صریح، مرفوع حدیث پیش کریں کہ نماز میں دو دو فٹ کھلے پاؤں کر کے کھڑے ہونے کا حکم ہو؟''

جواب علیزئی لا مذہب:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((أقیموا صفوفکم و تراصوا)) الخ

اپنی صفیں قائم کرو اور ایک دوسرے سے مل کر کھڑے ہو جاؤ۔ الخ (صحیح بخاری: ۷۱۹)

اس حدیث پر عمل کرتے ہوئے اپنے ساتھ نماز پڑھنے والے مقتدی کے کندھے اور قدم سے قدم ملانا چاہیے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالی عنہ ملاتے تھے دیکھئے صحیح بخاری (۷۲۵)۔

الحمدللہ اس حدیث پر اہل حدیث کا عمل ہے اور رہی بات دو دو فٹ والی تو یہ بریلوی سائل کا مسخرا پن اور ٹھٹھا ہے، جس سے اہل حدیث بری ہیں۔

اقول:

علیزئی صاحب! سوال میں نہ تو کندھے ملانے کے بارے میں اور نہ ہی پاؤں ملانے کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے بلکہ پاؤں کے فاصلے کی بات ہے۔ جس پر آپ سے کوئی جواب تو بن نہ سکا لکھ دیا کہ ''یہ مسخرا پن اور ٹھٹھا ہے جس سے اہل حدیث بری ہیں''۔

علیزئی جی! یوں لکھ دینے سے حقیقت بدل نہیں جائے گی، ہر وہ شخص جس نے کبھی لا مذہبوں کو جماعت کے ساتھ نماز پڑھتے دیکھا ہے اس بات سے واقف ہے کہ لا مذہب با جماعت نماز میں بالخصوص یوں ہی کھڑے ہوتے ہیں، اگر یقین نہ ہو تو اپنے لا مذہبوں کے پاؤں کے درمیان پیمانہ رکھ کر تجربہ کر لیں۔

علیزئی صاحب! جناب ایک بھی سوال کا جواب ہماری شرائط کے مطابق نہیں دے سکے اور قیامت تک دے بھی نہیں سکتے، ان شاء اللہ العزیز۔

حرف آخر:

اگر جناب میں کوئی دم خم ہے تو آیئے ہم پھر دعوتِ میدان دیتے ہیں، تشریف لائیں، اگر آنے میں کوئی قباحت محسوس کریں تو اپنے رسالہ میں شائع کر دیں کہ ہم نہیں تم آؤ اور وقت کا تعین بھی

کردو، ان شاء اللہ العزیز ہم آجائیں گے۔

اور ہاں یہ ذہن نشین رہے کہ کسی ایرے غیرے کی بات نہیں آپ جناب جو بزعم خویش علمی میدان کے بڑے شہسوار بنے ہوئے ہیں بات آپ سے ہوگی۔[جس میں انتظامی معاملات کی ہر قسم کی ذمہ داری جناب کو قبول کرنا ہوگی]۔

اب آخر میں ہم پھر یہ عرض کرتے چلیں کہ علیزئی لا مذہب نے جو سوالات اہل سنت احناف پر وارد کئے ہیں وہ صرف ہمارے اُصول سے ناواقفیت کی وجہ سے کئے ہیں۔

پہلے وہ کتبِ اُصولِ فقہ کو پڑھے اور احناف کے اُصول دیکھ کر سوال کرے، ہم ان شاء اللہ اس کی تشفی فرمادیں گے۔

محمد ارشد مسعود

ڈھول کا پول

از قلم :

محدث کبیر حضرت علامہ مولانا **محمد عباس رضوی** صاحب مدظلہ العالی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا﴾

لا مذہبوں کی طرف سے مذہبِ حق اہلِ سنت وجماعت پر اعتراضات کی بوچھاڑ اور ہر کارِ خیر کو بدعت کہنے کی روش میں روز بروز اضافے اور غلط پراپیگنڈہ کو دیکھتے ہوئے ہم نے چند احباب کے حکم کے مطابق لا مذہبوں کو آئینہ دکھانے کا ارادہ کیا اور لا مذہبوں کے معمولات پر چند سوالات وارد کئے کہ مسلمانوں کے اعمالِ خیر کو بدعت کہنے والے ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر سوچیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔

ہم نے پہلی قسط کے طور پر ربیع الاول شریف میں بارہ (۱۲) ربیع الاول کی مناسبت سے بارہ (۱۲) سوالات کئے۔ سوالات ایسے تھے جن پر لا مذہب عمل پیرا ہیں۔ ایک سائل ہونے کے ناطے سے نہ کسی پر اعتراض، نہ گالی گلوچ کیا گیا تھا بلکہ صرف سوالات کئے گئے تھے جو کہ ہر کسی کو حق پہنچتا ہے اس میں برا منانے کی کوئی بات بھی نہیں تھی۔ ابھی تک ان بارہ سوالوں کے دو حضرات کی طرف سے تحریری جوابات موصول ہوئے ہیں۔

پہلے حافظ محمد عبداللہ انجم (وہابی) خطیب واہنڈو کی طرف سے کہ جن کے جوابات ہم نے انہی کی مسجد کے قریب جلسہ عام میں بہت بڑے مخلوط مجمع کے سامنے دے دئے تھے۔ پھر وہ جوابات گوجرانوالہ کے ایک لا مذہب مولوی عبدالرشید انصاری نے ہمیں بذریعہ ڈاک ارسال کر دیئے، اور جواب الجواب کا مطالبہ کیا۔ ہم نے پہلی فرصت میں دس صفحات میں مختصراً جواب الجواب ارسال کر دیا۔

دوسرا جواب ایک لا مذہب مولوی فاروق اصغر صارم نے تحریری طور پر دیا۔ ہم دونوں حضرات کے جوابات کے جوابات مختصراً عرض کر رہے ہیں تاکہ حق کے متلاشیوں کو حقیقت کا پتہ چل جائے

☆ مولوی فاروق اصغر صارم نے لکھا ''ہم آپ حضرات کے بے حد شکر گزار ہیں کہ ہمیں غیر مقلدین اور وہابی کے نام سے مخاطب کیا، یہ الفاظ اگرچہ آپ نے گالی کے طور پر لکھے لیکن ہم اسے اپنے لئے بہت بڑا اعزاز اور باعثِ افتخار قرار دیتے ہیں کیونکہ غیر مقلدین وہ خوش قسمت لوگ ہیں جن کی گردن میں کسی انسان کا پٹا نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ اسے پسند کرتے ہیں، وہ اللہ تعالی کے احکام کے مطیع، رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے متبع، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوالِ صحیحہ کے قدر دان اور آئمہ کرام کی عزت واحترام کرنے والے ہوتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کا قدیمی لقب ''اہلِ حدیث اور اہلِ سنت'' ہے۔

اقول : ہم سمجھتے ہیں کہ جس طرح عالم کو عالم اور جاہل کو جاہل کہنا، اسی طرح مسلمان کو مسلمان اور کافر کو کافر کہنا گالی ہے اور نہ ہی ہو سکتی ہے، اسی طرح سُنّی کو سُنّی اور وہابی کو وہابی کہنا بھی گالی نہیں، پھر اگر کوئی گالی سمجھتے ہوئے بھی اس کو اعزاز سمجھے تو اس کو اس طرح باور ہی نہ کروانا چاہئے کہ فلاں نے ہمیں وہابی کہہ کر گالی دی ہے۔

ہم بھی یہ جانتے ہیں کہ آپ کی گردنوں میں کسی انسان کا پٹہ نہیں ہے اور نہ ہی آپ اسے پسند کرتے ہیں (سوائے اپنے مولویوں کے پٹے کے) حتی کہ شرفِ انسانیت محبوبِ خدا محمد مصطفی ﷺ۔

☆ مولوی صارم نے لکھا: ''اللہ تعالی نے اپنے بندوں کو اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کو اپنی اطاعت، اتباع کا حکم دیا ہے تقلید کا نہیں۔

اقول : کیا اللہ تعالیٰ نے اُولی الامر کی اطاعت کا حکم نہیں فرمایا؟

کیا ائمہ مجتہدین اُولی الامر میں داخل ہیں یا نہیں؟

اگر ہیں تو ان کی تقلید قابلِ مذمت کیوں؟ اور اگر داخل نہیں تو اس کی کیا دلیل ہے؟

مقولہ لا مذہب: ''دنیا کا کوئی فرد صحابہ کو مُقلّد کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔''

اقول: ''صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین خود مجتہد تھے، جو مجتہد ہوتا ہے وہ مقلد نہیں ہوسکتا اس لئے کوئی شخص ان کو مقلد نہیں کہتا۔ موجودہ دَور کے لا مذہب (وہابی) نہ مجتہد ہیں اور نہ ہی آئمہ مجتہدین کے مقلد، بلکہ اپنے جاہل مولویوں کے مقلد ہیں کیونکہ اپنے مولویوں کے خیالات کے مخالف نہ قرآن کی آیت دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ ہی احادیث صحیحہ کی پرواہ کرتے ہیں۔

مقولہ لا مذہب: ''بےنصیب ہیں وہ لوگ جنہوں نے اطاعت واتباع جیسے قرآنی اور حدیث کے کلمات کونظر انداز کر دیا اور اندھی تقلید پر قناعت کر بیٹھے اور اسلاف وآئمہ امت کے بالمقابل جا کھڑے ہوئے۔''

اقول: معلوم ہوتا ہے کہ اس عقل کے اندھے کو تقلید واطاعت کے مفہوم ومعانی کا بھی علم نہیں ہے ورنہ میں عرض کروں گا کہ بدنصیب ہیں وہ لوگ جو قرآن وحدیث کے الفاظ کو چھوڑ کر اپنے آپ کے لئے وہابی، اہل حدیث، سلفی، اثری، زاہدی، نجدی وغیرہ کے الفاظ ونام پسند کرتے ہیں۔

مقولہ لا مذہب: اگر آپ کو انکار ہے تو بتایئے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں اور نبی ﷺ نے اپنی اُمت کو کہا کہ ہماری تقلید کرو۔

اقول: پہلے آپ تقلید واطاعت کے مفہوم کو پڑھ لیں اس کا جواب آپ کو خود بخود پتہ چل جائے گا، ویسے عرض یہ ہے کہ کیا اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے فرمایا تھا کہ کسی مجتہد کی تقلید نہ کرنا، اگر فرمایا ہے تو کہاں ہے بحوالہ لکھئے۔

مقولہ لا مذہب: کیا امام ابوحنیفہ مقلد تھے؟

اقول: کیا مقلد کی بھی تقلید کی جاتی ہے؟

مقولہ لا مذہب: ''تو سنئے ہم خود کو اہلِ حدیث کہتے ہیں۔''

اقول: اپنے آپ کو جو چاہے ہر شخص کہلا سکتا ہے لیکن یہ اہل حدیث نام آپ نے کب سے رکھا ہے؟ تمام اہلِ علم بخوبی جانتے ہیں کہ یہ نام آپ کے بڑوں نے انگریز سرکار سے الاٹ کروایا تھا، تاریخ گواہ ہے۔

ہم الحمدللہ اہل سنت ہیں اور ہم نے یہ نام کسی انگریز یا یہودی سے الاٹ نہیں کروایا بلکہ اللہ کے محبوب ﷺ اور ان کے پیارے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے ہمیں یہ نام عطا فرمایا ہے اور غیر اہلِ سنت میں عموم ہے جس میں سبھی اہل بدعت وغیر مسلم شامل ہیں۔

مقولہ لا مذہب: ''آپ نے وہابی کا کلمہ ہمارے لئے بطور گالی کے استعمال کیا ہے۔''

اقول: یہ نام ہی اتنا بدنام ہے کہ یہ کسی بھی سچے مسلمان کے لئے گالی سے کم نہیں ہے۔

مقولہ لا مذہب: ''کیونکہ وہاب اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام ہے اس کو ماننے والا اس کے احکام پر عمل کرنے والا وہابی کہلانے کا حقدار ہے۔''

اقول: دہر بھی اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام ہے لہذا آپ دھریئے ہوئے اس لئے آپ کا کوئی قصور نہیں ہے، لہٰذا آج کے بعد آپ اپنے نام کے ساتھ دھریہ لکھا کریں ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔

مقولہ لا مذہب: ''وہابی کہہ کر اگر آپ نے ہماری نسبت اس مجدد ''محمد بن عبدالوہاب'' کی طرف کی ہے جنہوں نے حجاز کی مقدس سرزمین پر قبوریوں، مشرکوں اور بدعتیوں کی حکومت کا قلع قمع کیا اور نظام نبوی کی ترویج وتبلیغ کے لئے ان تھک تگ ودَو کی، تو ہمارے لئے یہ نسبت بھی ناپسند نہیں۔

اقول: وہ گستاخِ رسول اور شیطان کا سینگ مجدد تو ہرگز نہیں ہوسکتا، ہاں مرزا قادیانی کی طرز کا

مجدد ضرور ہوگا۔

آپ کی عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نجدی سینگ سے پہلے بارہ (۱۲) صدیاں حجاز مقدس پر معاذ اللہ مشرکوں کی حکومت تھی، پوری اُمت محمدیہ کو مشرک سوائے نجدی وہابی کے اور کوئی نہیں کہہ سکتا، اس لئے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

" قال رسول الله ﷺ : ان ما أتخوف عليكم رجل قراء القرآن حتى اذا رؤيت بهجته عليه وكان ردائا للاسلام ، غيره الى ما شاء الله ، فانسلخ منه، ونبذه وراء ظهره، وسعى على جاره بالسيف، ورماه بالشرك قال : قلت : يا نبي الله ﷺ، أيهما أولى بالشرك ، المرمى أم الرامي ؟ قال : بل الرامي .

(صحيح ابن حبان ۱/۲۸۲ (۸۱) مسند البزار كشف الاستار ۱/۹۹ (۱۷۰) مشكل الاثار ۲/۳۲۴ (۸۶۵) المعجم الكبير ۲۴/۸۸ (۱۲۹) مسند الشاميين ۲/۲۵۴ (۲۹۱) كتاب المعرفة والتاريخ للفسوى ۲/۳۵۸،عن معاذ بن جبل،وغيرهم.

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ''مجھے تم پر اس شخص کا ڈر ہے جو قرآن پڑھے گا، جب اس پر قرآن کی رونق آجائے گی اور اِسلام کی چادر اس نے اوڑھ لی ہوگی تو اللہ اُسے جدھر چاہے گا بھگا دے گا، وہ اسلام کی چادر سے نکل جائے گا اور اسے پس پُشت ڈال دے گا اور اپنے پڑوسی پر تلوار چلانا شروع کر دے گا اور اس پر شرک کے طعنے مارے گا، راوی کہتے ہیں میں نے عرض کیا: اے اللہ عزوجل کے نبی ﷺ شرک کا زیادہ حق دار کون ہوگا، جس پر شرک کی تہمت لگائی جائے گی یا شرک کی تہمت لگانے والا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: بلکہ شرک کی تہمت لگانے والا شرک کا زیادہ حق دار ہوگا۔''

مقولہ لا مذہب: لیکن عقل ودانش کا تقاضہ تھا کہ ہمیں اس نام کی مناسبت سے محمدی کہا جاتا، باقی رہا عبدالوہاب تو یہ ان کے والد کا نام تھا۔

اقول: حضرت امام شافعی کا نام محمد بن ادریس رحمۃ اللہ علیہ تھا اور ان کے ماننے والوں کو شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے ماننے والوں کو حنبلی کہا جاتا ہے آپ کے نزدیک اس پر عقل و دانش کا کیا تقاضہ ہے؟۔

مقولہ لا مذہب: ''محمد نامی شخصیت کے دینی واسلامی کارناموں کو ہماری جھولی اور کھاتے میں ڈالنا اور نسبت ان کے والد گرامی کی طرف کر دینا خالص جہالت یا صریح فراڈ ہے جس پر ابلیس بھی یقیناً شرمندہ ونادم ہوگا۔

اقول: یہی الفاظ جناب والا ان تمام محدثین وعلماء اُمت کے بارے میں بھی فرمائیں گے جنہوں نے شوافع کو محمدی اور حنابلہ کو احمدی کہنے کی بجائے شافعی اور حنبلی کہا (ویسے آپ جیسے لوگوں سے یہ بعید بھی نہیں ہے)

اس کے آگے مولوی مذکور نے صفحہ نمبر ۴ اور ۵ پر بہت سارے پاپڑ بیلے ہیں تا کہ اپنے جاہل عوام کو مطمئن کر سکیں کیونکہ ہمارے سوالات کے جوابات مولوی صارم تو کیا پوری دنیا سے کوئی بھی نجدی لا مذہب مذکورہ شرائط کے مطابق دینے کی طاقت نہیں رکھتا اسی لئے بار بار یہ باور کروا رہا ہے کہ مرفوع نہ سہی موقوف ہی سہی، صریح نہ سہی غیر صریح ہی سہی۔

ہم بتانا چاہتے ہیں کہ یہ لوگ جب اپنے گھر کی بات آتی ہے تو سب کچھ قبول کرتے جاتے ہیں اور جب دوسروں کی باری آتی ہے تو صرف قرآن اور صحاح ستہ سے نیچے کا مطالبہ نہیں کرتے۔

اب آیئے مولوی مذکور کے جوابات ملاحظہ فرمائیں اور غیر مقلدین کی اُصول شکنی اور دلائل سے یتیم ہونے کو دیکھیں۔

سوال نمبر 〈۱〉

کیا نبی اکرم ﷺ نے نماز وتر میں بعد از رکوع عام دُعا کی طرح ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگی ہے یا آپ

صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا ہے؟

جواب :''قنوت وتر میں دعا مانگنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رکوع سے پہلے اور رکوع کے بعد دونوں طرح ثابت ہے رکوع سے پہلے قنوت وتر کی دعا مانگنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہے جب کہ رکوع کے بعد قنوت وتر کی دعا مانگنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے حکم والی روایت کی صورت یعنی رکوع کے بعد قنوت وتر کی دعا پڑھنا ہمارے ہاں زیادہ بہتر ہے (دیکھئے کتب اصول)

اقول : ہم نے سوال کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ وتر میں بعد از رکوع عام دُعا کی طرح ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگی تھی۔

مجیب (اول) کہتا ہے کہ رکوع کے بعد قنوتِ وتر کی دُعا پڑھنا ہمارے ہاں جائز ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس کی دلیل کیا ہے آپ نے جو روایت نقل کی ہے وہ تو ہماری شرائط کے مطابق صحیح نہیں ہے بلکہ مجیب نے خود ہی تسلیم کرلیا ہے کہ علامہ البانی نے اس روایت کو حسن قرار دیا ہے یعنی مجیب کے نزدیک بھی یہ حسن ہے صحیح نہیں ہے۔

ویسے مجیب ہی کی جماعت کے ایک فاضل لامذہب نے لکھا ہے کہ ''مگر یہ روایت قابل اعتماد نہیں امام بیہقی اسے ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اسے بیان کرنے میں ابوبکر بن شیبۃ حزامی متفرد ہے۔ حافظ ابن حجر تلخیص ۱/ ۲۴۸ میں اس روایت کو حاکم کے حوالے سے ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اس طریق میں '' اذا رفعت رأسی ولم یبق الا السجود'' یہ قابل غور ہے، میں نے فوائد ابواحمد بن الحسین بن مہران کا دوسرا جزء حاکم کی تخریج کے ساتھ دیکھا اس میں یہ حدیث اس سند سے یوں ہے:

'' حدثنا محمد بن یونس المقری ثنا الفضل بن محمد البیهقی ثنا ابو بکر بن شیبة المدنی الحزامی ثنا ابن ابی فدیک عن اسماعیل بن ابراهیم بن عقبه

بسندہ .... خلاصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول فعل اور صحابہ کے عمل سے قنوت قبل الرکوع ہی ثابت ہے۔ (صلوۃ الرسول ۴۰۰۔۴۰۱)

مقولہ لا مذہب: ''باقی رہا ہاتھ اُٹھانے کا مسئلہ''

اقول : سوال ہے قنوت في الوتر کا اور جواب ہے صبح کی نماز میں قنوتِ نازلہ کا استدلال تو ایسا بمصداق شاعر:

بک رہا جنوں میں کیا کیا — کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

پھر جو روایت پیش کی اس کی سند بھی ضعیف۔

مذکورہ روایت کی سند اس طرح ہے: ''أخبرنا أبو عبد الرحمن السلمي وأبو نصر بن قتادة قالا أنبأ أبو محمد يحيى بن منصور القاضي أنبأ أبو القاسم علي بن صقر بن موسى السكري ببغداد في سويقة غالب من كتابه ثنا عفان بن مسلم ثنا سليمان بن المغيرة عن ثابت عن أنس بن مالك ... (السنن الکبریٰ للبیہقی ۲/ ۲۲۱)

یہ سند ضعیف ہے اس میں ایک راوی علی بن صقر ہے۔ جس کو امام دارقطنی نے ضعیف کہا ہے۔

امام دارقطنی فرماتے ہیں: '' ليس بالقوي '' (سوالات الحاكم عن الدارقطني ۱۲۴)

اور اس کی توثیق کسی سے بھی نہیں ملی۔

[نوٹ] اس روایت کے ایک دوسرے راوی عفان بن مسلم ہے کے بارے میں قبلہ نے امام ابن عدی کے حوالہ سے سلیمان بن حرب ازدی کا قول نقل کیا تھا کہ ''كان بطيئا ردئ الحفظ بطئ الفهم .'' (الکامل في الضعفاء ۵/ ۲۰۲۱) یہ جرح موجود ہے، مگر عفان بن مسلم جمہور کے نزدیک ثقہ راوی ہے۔ ارشد مسعود عفی عنہ]۔

مزید اس بارے میں علیزئی کے سوال کے جواب میں بیان ہو چکا۔

مقولہ لا مذہب: ''اس کی مثال یوں ہے کہ کسی بھی مرفوع صحیح، صریح حدیث میں نہیں آیا کہ آپ ﷺ نے نمازِ جنازہ میں **سبحانک اللّٰھم** پڑھا ہو یا تلقین فرمائی ہو اس کے باوجود فرض نماز کی طرح جنازہ کو نماز سمجھتے ہوئے ہم اور آپ بھی سبحانک اللّٰھم پڑھ لیتے ہیں۔''

اقول: ہم تو اس لئے سبحانک اللّٰھم جنازہ میں پڑھتے ہیں کہ ہم قیاس کے قائل ہیں، ہم جنازہ کی ثنا کو فرض نماز کی ثناء پر قیاس کرتے ہیں لیکن چونکہ آپ لوگ نہ صرف قیاس کے منکر بلکہ قائلینِ قیاس کو گمراہ اور ابلیسی ٹولہ جیسے مکروہ و نازیبا القاب سے یاد کرتے ہیں، اس لئے آپ یہ نہیں پڑھ سکتے، ویسے یہ آپ نے خود ہی اپنے آپ پر ایک سوال کھڑا کر لیا ہے۔

الحمدللہ ہمارا سوال نمبر (۱) اسی طرح قائم ہے اور تمام وہابیوں اور لامذہبوں کے سر پر ہمارا یہ اُدھار ابھی تک قائم ہے اور تا قیامت قائم رہے گا۔ (ان شاء اللہ العزیز)

سوال نمبر ﴿۲﴾

کیا نبی اکرم ﷺ نے نماز جنازہ کی تمام تکبیرات میں رفع الیدین کرنے کا حکم فرمایا ہے یا آپ ﷺ نے خود نماز جنازہ کی تمام تکبیروں کے ساتھ رفع الیدین فرمایا ہے؟۔

جواب: ''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جنازہ کی ہر تکبیر پر رفع الیدین کیا کرتے تھے۔ (العلل لدارقطنی)

اس روایت کے متعلق شیخ ابن باز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''اس روایت کے تمام روات ثقاۃ ہیں ۔عمر بن شبہ ثقہ راوی ہے۔ (بحوالہ حاشیہ فتح الباری ۳/۱۹۰)

اس روایت کے راوی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بھی جنازہ کی ہر تکبیر کے ساتھ رفع الیدین کیا کرتے تھے۔'' (صحیح البخاری مع الفتح ۳/۱۸۹)

اقول: سبحان اللّٰہ! رواۃ کی ثقاہت بیان کرنے کے لئے پوری اُمت سے صرف ابن

باز ہی ملا۔ میں پوچھتا ہوں کہ یہ کہاں کا محدث ہے اور اس کی رائے رواۃ کی ثقاہت و ضعف میں کہاں تک معتبر ہے؟

اور پھر مجیب نے یہ روایت امام دارقطنی کی علل الحدیث کے حوالے سے نقل کی ہے اور امام دارقطنی کا فیصلہ ہضم کر گیا، آخر کیوں؟

غیر مقلدین کے محدث شمس الحق عظیم آبادی نے لکھا ہے۔

قال الدارقطني هكذا رفعه عمر بن شبة وخالفه جماعة فرووه عن يزيد بن هارون موقوفا وهو الصواب .

(التعليق المغني على سنن الدارقطني ۲/۷۵)

لہٰذا یہ روایت موقوف ہے مرفوع نہیں ہے، جیسے کہ آپ ہی کے ایک محدث عبدالرحمٰن مبارک پوری نے ''تحفۃ الاحوذی'' میں اس کی صراحت کی ہے، اور مولوی محمد عبدہ فیروز آبادی لامذہب نے لکھا ہے کہ:

امام شوکانی نے لکھا ہے: ''**والحاصل انه لم يثبت في غير التكبيرة الأولى شيء يصلح للاحتجاج به عن النبي ﷺ وأفعال الصحابة وأقوالهم لا حجة فيها فينبغي أن يقتصر على الرفع عنه تكبيرة الأحرام.** [نيل الأوطار ۴/۱۰۲]

اور حاصل کلام یہ ہے کہ سوائے تکبیر تحریمہ کے رسول اللہ ﷺ سے کوئی شے (حدیث) ایسی نہیں جس سے احتجاج کیا جا سکے۔ باقی رہے اقوال و افعال صحابہ، وہ ویسے ہی حجت نہیں ہیں، لہٰذا چاہیئے کہ صرف تکبیر تحریمہ کے وقت ہی رفع یدین کیا جائے۔

علامہ البانی اپنے احکام میں لکھتے ہیں:

تکبیر اولی کے ماسوا باقی تکبیرات میں رفع الیدین کی مشروعیت پر ہمیں کوئی دلیل نہیں مل سکی لہٰذا یہ

غیر مشروع ہے جیسا کہ احناف کا مسلک ہے، امام شوکانی وغیرہ محققین نے بھی اسے اختیار کیا ہے اور یہی مسلک ابن حزم (غیر مقلد لامذہب) کا ہے۔

(احکام الجنائز ص۱۷۹ از فیروز آبادی)

مولوی وحیدالزمان (غیر مقلد) نے لکھا: ''**ولا یرفع یدیه الا في تکبیرة الاولی**''.

(کنز الحقائق من فقه خیر الخلائق ص ۷۱)

اور سوائے پہلی تکبیر کے (جنازہ میں) رفع الیدین نہ کیا جائے۔

مقولہ لا مذہب: ''اس روایت کے راوی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی جنازہ کی ہر تکبیر کے ساتھ رفع الیدین کرتے تھے۔ (صحیح البخاری مع الفتح ۳/۱۸۹)

اقول: یہ صحیح البخاری، بخاری کی کس عبارت کا ترجمہ ہے؟۔

صحیح بخاری میں صرف ''**و یرفع یدیه**'' کے الفاظ ہیں یہ ہر تکبیر کے ساتھ آپ کہاں سے لے آئے؟۔

کیا یہ دھوکہ دہی اور جھوٹ نہیں؟

جب کہ اس کے تحت امام الفقہاء والمحدثین امام بدرالدین عینی فرماتے ہیں:

(و یرفع یدیه) مطلق یتناول الرفع في أول التکبیرات ویتناول الرفع في جمیعها وعدم تقیید البخاري ذلک یدل علی أن الذي رواه في کتاب رفع الیدین غیر مرضی عنده اذ لو کان رضی به لکان ذکره في الصحیح أو قید .... قد ذکرنا عن قریب أن ابن حزم حکی عن ابن عمر أنه لم یرفع الا في الأولی وقال لم یأت فیما عدا الأولی .

(عمدة القاری شرح صحیح البخاری ۸/۱۲۴)

اور آپ ہاتھ اٹھاتے یہ مطلق ہے، یہ ممکن ہے کہ آپ صرف پہلی تکبیر میں ہاتھ اٹھاتے اور یہ بھی ہو

سکتا ہے کہ آپ تمام تکبیرات میں ہاتھ اٹھاتے، اور امام بخاری کا اس کی تقیید نہ فرمانا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ امام بخاری نے جو جزء رفع الیدین میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ہر تکبیر کے ساتھ رفع الیدین روایت کیا ہے آپ اس سے خوش نہیں، اور اگر آپ اس کو صحیح سمجھتے تو اپنی صحیح میں اس کو نقل کرتے یا اس کی کم از کم تقیید ہی کر دیتے، اور ہم نے بیان کیا ہے کہ ابن حزم نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالی عنہما سے روایت کی ہے کہ آپ نماز جنازہ میں صرف پہلی تکبیر کے ساتھ رفع الیدین کرتے اور اس کے بعد نہیں کرتے تھے۔

اس تمام بحث سے ثابت ہوا کہ ہمارا سوال ابھی تک قائم ہے اور دونوں وہابی لا مذہب اس کا جواب نہیں دے سکتے۔

سوال نمبر ﴿۳﴾

حضور اکرم ﷺ نے اپنے کس کس شہید صحابی کی غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھائی تھی؟

جواب: ''عبارت سوال سے واضح ہو رہا ہے کہ غیر شہید کی غائبانہ نماز جنازہ آپ تسلیم کر چکے ہیں''۔

اقول: سوال میں شہید کی قید صرف اس لئے لگائی گئی ہے کہ آج کل جگہ جگہ لامذہب اپنے نام نہاد شہداء کے غائبانہ جنازے بڑے دُھوم دھام سے، اشتہار چھپوا کر، گاؤں گاؤں اعلانات کر کے پڑھاتے ہیں۔ دراصل چونکہ وہابی لوگ شتر بے مہار قسم کی قوم ہے، ان کا مذہب شہر بدلنے سے بدل جاتا ہے اور وقت بدلنے سے بدل جاتا ہے آج سے چند سال پہلے وہابی شہید کی مطلق نماز جنازہ کے ہی قائل نہیں تھے، اگر چہ شہید کی میت سامنے موجود ہو لیکن اب چندہ بٹورنے کے لئے غائبانہ بھی شروع کر دی ہے۔

لامذہب مجیب کا کہنا ہے کہ ''جو دلیل غیر شہید کی ہے وہی دلیل شہید کی سمجھ لیجئے۔

اقول: کیا شہید وغیر شہید کے غسل وجنازہ میں کوئی فرق ہے یا کہ نہیں؟

ہمارے نزدیک نہ شہید کی غائبانہ نماز درست ہے اور نہ ہی غیر شہید کی، آج سے چند سال پہلے پیچھے چلیں تو آپ کو وہابیوں کے شہید کے متعلق یہ فتوی ملے گا۔

مولوی صادق سیالکوٹی لامذہب نے لکھا ہے:

''حضور انور نے شہیدوں کو خون سمیت دفن کرنے کا حکم دیا ہے اور نہ ان پر نماز جنازہ پڑھی اور نہ ان کو غسل دیا۔ (بخاری) معلوم ہوا کہ شہید کو بغیر غسل اور جنازہ پڑھنے کے دفن کرنا چاہیے۔

(صلاۃ الرسول مع التخریج ص ۴۸۷)

مقولہ لامذہب: ''(ب) یہ مسئلہ اہل علم کے ہاں مختلف فیہ ہے شہید کے جنازہ کے قائلین کے پاس جو دلائل ہیں ان میں سے صرف ایک روایت کو ذکر کیا جاتا ہے۔

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن نبی کریم ﷺ نکلے پس آپ نے شہداء احد پر اس طرح نماز ادا کی جس طرح آپ ﷺ میت پر نماز ادا کرتے تھے۔ (صحیح بخاری ۱/۱۷۹) واضح رہے آپ ﷺ کے میدان احد میں جا کر یہ نماز ادا کرنے کا واقعہ غزوہ احد سے آٹھ سال بعد کا ہے۔''

اقول: سبحان اللہ! تحقیق ہو تو ایسی، بات ہو رہی ہے شہید کے غائبانہ نماز جنازہ کی اور دلیل دی جا رہی ہے مطلق نماز جنازہ کی۔

مجیب ثانی یہ تسلیم کرتا ہے کہ یہ نماز آپ ﷺ نے اُحد شریف جا کر پڑھائی تھی جب کہ مجیب اول اس کو غائبانہ ثابت کر رہا ہے کہ یہ مدینہ شریف میں پڑھائی تھی۔

پھر اس حدیث کی تفہیم میں بھی کافی اختلاف ہے، حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

'' قال النووی: المراد بالصلوة هنا الدعاء، وأما كونه مثل الذي على الميت

فمعناه أنه دعا لهم بمثل الدعاء الذي كانت عادته أن يدعو به للموتى.

(فتح الباری ۳/۱۶۴، وفي نسخة ۱/۸۴۰)

امام نووی نے فرمایا کہ یہاں ''صلوۃ'' بمعنی دُعا ہے، اور یہ کہنا کہ جیسے میت کے لئے ''صلوۃ'' پڑھتے ہیں، تو اس کا معنی یہ ہے کہ اس طرح دُعا کی جس طرح موتی کے لئے دُعا کرنے کی آپ ﷺ کی عادت مبارکہ تھی۔

امام ابوزرعہ عراقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

''ان المراد بها الدعاء وليس المراد بها صلوة الجنازة المعهودة، قال النووی: أي دعا لهم بدعاء صلاة الميت. (طرح التثريب في شرح التقريب ۳/۲۹۵)

یہاں ''صلوۃ'' سے مراد دُعا ہے نہ کہ نمازِ جنازہ اور امام نووی نے فرمایا کہ ان کے لئے میت والی دُعا مانگی۔

لہٰذا ثابت ہوا کہ لامذہبوں، غیر مقلدین کے پاس اس کی کوئی صحیح، صریح، مرفوع حدیث نہیں ہے بلکہ اگر ضعیف بھی ہوتی تو ضرور پیش کرتے۔

سوال نمبر (۴)

ایک صحیح، صریح، مرفوع حدیث پیش کریں کہ نماز جنازہ میں امام دعائیں بلند آواز سے پڑھے اور مقتدی صرف آمین آمین پکاریں۔

جواب: نماز جنازہ سراً پڑھانا بھی درست ہے اور جہراً پڑھانا بھی صحیح ہے جہاں تک دعائیں سراً پڑھنے کا ذکر ہے وہ تو گوشہ آپ کو معلوم ہے البتہ اگر نہیں معلوم تو وہ بلند آواز سے دعائیں پڑھنے کا گوشہ ہے لیجئے اس وقت ایک روایت بطور دلیل پیش کی جاتی ہے شاید سید الکونین ﷺ کا عمل آپ پر بھی اثر کر جائے۔

حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ نماز جنازہ پڑھائی تو میں نے آپ ﷺ کی وہ تمام دعائیں یاد کرلیں جو آپ نے اس موقعہ پر پڑھی تھیں اور وہ یہ تھیں: ''اللھم اغفرلہ وارحمہ۔۔۔۔۔الخ (صحیح مسلم بحوالہ مشکوۃ المصابیح کتاب الجنائز)

وضاحت: صحابی رسول ﷺ کا آپ کی دعاؤں کو یاد کرنا تبھی ہوسکتا ہے جب آپ ﷺ نے بلند آواز سے پڑھی ہوں، سرا پڑھنے سے تو سنائی نہیں دیتیں یاد کرنا کیسے ممکن تھا۔

باقی رہا آپ کے پیچھے صحابہ کرام کا آمین آمین کہنا تو جب رسول اللہ ﷺ نماز میں دعائیں پڑھتے تو صحابہ کرام پیچھے آمین آمین کہا کرتے تھے، جیسا کہ ابھی اگلے سوال کے جواب میں وضاحت سے بیان ہوگا۔

اقول: نمازِ جنازہ سرا پڑھنا ہی سنت ہے۔ جہراً نہ آپ ﷺ نے پڑھا اور نہ ہی اس کا حکم فرمایا ہے اور نہ ہی تا قیامت کوئی لامذہب اس کو مذکورہ شرائط کے مطابق ثابت کرسکتا ہے، آپ کی مستدل روایت کے بارے میں امام نووی فرماتے ہیں:

''واما الدعا فیسر بہ بلا خلاف وحینئذ یتاول ھذا الحدیث علی ان قولہ حفظت من دعائہ أي علمنیہ بعد الصلوۃ فحفظت.

(شرح مسلم للنووي ۱/۳۱۱)

اور جنازہ میں دُعا بالاتفاق سرا پڑھی جائے گی، تو اس حدیث کی تاویل یہ ہوگی کہ صحابی کا فرمانا کہ میں نے دُعا حفظ کرلی یعنی آپ ﷺ نے نمازِ جنازہ کے بعد مجھ کو دُعا سکھلائی تو میں نے اس کو حفظ کرلیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ امام نووی کے دَور تک کوئی قوم جنازہ میں دُعائیں بلند آواز سے پڑھنے والی نہیں تھی، یہ بعد کی پیداوار ہے۔

مولوی محمد عبدہ فیروز آبادی لامذہب نے لکھا ہے: ''جمہور علماء سری کے قائل ہیں امام شوکانی لکھتے ہیں:'' و ذهب الجمهور الى انه لا يستحب الجهر في صلاة الجنازة .

(نیل الاوطار ۴/۶۶)

اور حضرت ابن عباس والی حدیث کا جواب ظاہر ہے وہ خود فرما رہے ہیں:''لم اقرأ أي جهرا الا لتعلموا أنه سنة''.

اور پھر حضرت ابوامامہ بن سہل سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ کے صحابہ میں سے ایک شخص نے بتایا نماز جنازہ میں سنت یہ ہے کہ آہستہ پڑھی جائے۔ (احکام الجنائز ۱۸۷۔۱۸۸)

تنبیہ: حدیث کے الفاظ ''میں نے آپ سے یہ دعا یاد کرلی'' سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت یہ ادعیہ باآواز بلند پڑھتے تھے لیکن ملا علی قاری اس کی تاویل کرتے ہوئے لکھتے ہیں: یہ اسرار بالدعا کی مندوبیت کے خلاف نہیں کیونکہ یہاں جھرا (اگر ثابت ہو تب) پڑھنا محض تعلیم کے لئے تھا۔

(احکام الجنائز: ۱۹۱)

مولوی عبدالرؤف لامذہب نے لکھا:

''مگر اس حدیث سے حجت لینا محل نظر ہے کیونکہ مسند احمد (۶/۲۳) میں عوف رضی اللہ عنہ کے الفاظ یہ ہیں ''ففهمت من مهلاته عليه اللّٰهم اغفرله'' یعنی میں آپ کی نماز سے یہ کلمات سمجھا۔۔۔۔ بظاہر اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دھیمی آواز میں دعا پڑھی ہوگی اور عوف بن مالک آپ کے قریب کھڑے ہوں گے تو انہوں نے یہ دعا سن لی نماز جنازہ کی دعاؤں کے بارے میں جو دوسری روایات ہیں ان سے بھی دعاؤں کو جھرا پڑھنے پر استدلال کیا جاتا ہے ان روایات سے بھی استدلال کی نوعیت بالکل وہی ہے جو پچھلی حدیث کی نوعیت ہے۔

(صلاۃ الرسول ۴۸۳۔۴۸۴)

الحاصل: نماز جنازہ میں قرات سرا پڑھنی چاہیے اس بارے میں نص موجود ہے۔

(صلاۃ الرسول ۴۸۴)

پس ثابت ہوا کہ جب سرے سے نمازِ جنازہ بلند آواز سے پڑھنی ہی سنت کے خلاف ہے تو آمین آمین والا مسئلہ خود بخود بدعت ٹھہرے گا۔

حافظ محمد گوندلوی لا مذہب نے لکھا:

''نماز جنازہ میں مقتدی اپنی جگہ دعا کرے صرف آمین کا کہیں ذکر نہیں ہے۔

(فتاوی علمائے حدیث ۵/۱۵۴)

ایک اور لا مذہب لکھتا ہے:

''نماز جنازہ کی دعاؤں پر مقتدیوں کے آمین کہنے کا ثبوت جہاں تک راقم کو معلوم ہے آنحضرت اور عہد صحابہ وتابعین میں نہیں ملتا بنابریں اس عمل کو خلاف سنت کہا جائے گا۔

(فتاوی علمائے حدیث ۵/۱۹۱)

مقولہ لا مذہب: ''اس کا ایک عام فائدہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں اکثر لوگوں کو جنازے کی دعائیں یاد نہیں ہوتیں، حالانکہ جنازہ کا مقصد دعا ہے آمین کی وجہ سے ہر ایک کی شرکت ہو جاتی ہے۔''

اقول: کیا ایسی توجیہات کسی اور کو بھی کرنے کی اجازت ہے کہ نہیں؟

اگر ہم کہیں کہ آج کل لوگ بڑے مصروف ہیں اس لئے اذان کے بعد تثویب کہہ لی جائے تاکہ لوگوں کو بروقت جماعت کا پتہ چل جائے تو کیا آپ اس کی اجازت دیں گے؟

اگر ہم کہیں کہ ایصال ثواب تو ہر وقت ہو سکتا ہے، اپنی اور دیگر عزیزوں کی آسانی کے لئے مرنے والے کے تین یا دس یا چالیس دن کے بعد ایصال ثواب کے لئے اکٹھے ہو جائیں تو دین کی کوئی بنیاد قائم رہے گی یا کہ نہیں؟۔

آپ دوسرے سے ہر بات پر صریح، مرفوع احادیث یا نصوص قطعیہ کا مطالبہ کرتے تھکتے نہیں اور ذرا ذرا سی بات پر بدعت وضلالت کا گولہ تھوپ دیتے ہیں لیکن جب اپنی باری آئی تو کہہ دیا کہ'' تو اس کا عام فائدہ یہ ہے۔

کیا یہ فائدہ پیارے آقا ﷺ کے ذہن مبارک میں نہ آیا، صحابہ کرام کو اس فائدے کا پتہ نہ چلا، یہ فائدہ چودھویں صدی کے لا مذہبوں کو ہی نظر آیا؟۔

سوال نمبر ﴿۵﴾

ایک صحیح، صریح، مرفوع حدیث پیش کریں کہ نمازِ وتر میں رکوع کے بعد امام بلند آواز سے دُعائے قنوت پڑھے اور مقتدی صرف آمین آمین پکاریں۔

جواب: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالی عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ایک ماہ مسلسل پانچوں نمازوں کی آخری رکعت میں رکوع کے بعد دعا قنوت پڑھی جس میں بنی سلیم، رعل، ذکوان، عصیہ قبائل (جنہوں نے قراء کو شہید کر دیا تھا) پر اونچی آواز میں بدعا کی اور مقتدی آمین آمین پکارتے رہے۔ (قیام اللیل للمروزی ۲۳۵)

اقول: سبحان اللہ العظیم! سوال ہے وتروں کا، جواب ہے فرض نمازوں کا، سوال ہے دُعائے قنوت کا، جواب ہے قنوت نازلہ کا، اسی کو کہتے ہیں تحقیق۔ یہ واقعی ''سوال گندم جواب چنا'' والا محاورہ بن گیا ہے۔

مقولہ لا مذہب: قنوتِ وتر بھی قنوت نازلہ کی طرح دُعائیہ کلمات پر مشتمل ہے دونوں نماز کی آخری رکعت میں ہی کئے جاتے ہیں اس حدیث کی روشنی میں جماعت کی صورت میں اگر اونچی آواز سے امام قرات کرے گا تو مقتدی باواز بلند ہی آمین آمین کہیں گے۔

اقول: کیا تشہد میں پڑھی جانے والی ادعیہ مبارکہ دُعا نہیں ہیں؟ کیا وہ تمام ہر مقتدی کو یاد ہیں؟

اگر نہیں تو پھر ان کو بھی بلند آواز سے پڑھیں تا کہ لوگ آمین کہہ کر ان تمام ادعیہ ماثورہ کی فضیلت کا ثواب حاصل کر سکیں۔

پہلے تو آپ رسول پاک ﷺ سے دعائے قنوت في الوتر بلند آواز سے ثابت کریں، وہ آپ قیامت تک نہیں کر سکتے اور پھر اس کے بعد مقتدیوں کا آمین کہنے پر قیاس بھی کر لیں۔ آپ کے کہنے کے مطابق ہمیں تو تقلید حق قبول کرنے سے روکتی ہے، میں پوچھتا ہوں کہ جب آپ کو معلوم ہو گیا کہ آپ ﷺ نے ساری عمر اس طرح قنوت نہیں پڑھی تو اب آپ کے لئے حق قبول کرنے میں کونسی چیز مانع ہے؟

ہم اگر سال میں ایک بار میلاد منائیں تو بدعتی، آپ پورے سال میں تمام بدعتیں کرنے پر بھی اہل حدیث وموحد، کیا یہی انصاف ہے؟

ہم میلاد کے ثبوت دیں پھر بھی بدعتی، آپ اس کا ثبوت بھی نہ دیں قیاس مع الفارق کریں پھر بھی اہل حدیث؟ قال اللہ تعالی: ﴿اعدلوا هو أقرب للتقوى﴾

سوال نمبر (۶)

کیا نبی اکرم ﷺ نے حکم فرمایا تھا کہ نماز میں ہاتھ سینہ پر باندھے جائیں یا آپ ﷺ نے خود نماز میں سینہ پر ہاتھ باندھے تھے؟

جواب: رسول اللہ کا نماز میں سینے پر ہاتھ باندھنا ایسی واضح حقیقت ہے جس کو کئی ایک روایات کی تائید حاصل ہے جگہ کی کمی کی وجہ سے صرف ایک روایت پیش کی جاتی ہے۔

حضرت وائل بن حجر رضی اللہ تعالی عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کے ساتھ نماز ادا کی تو میں نے دیکھا آپ ﷺ نے دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھ کر سینہ کے اوپر رکھا ہوا تھا۔
(صحیح ابن خزیمہ ۱/۲۴۳)

اقول: جناب وہ کئی ایک روایات کہاں ہیں؟ جگہ کی کمی سے کیا مراد ہے؟ کیا یہ فرض تھا کہ اس پمفلٹ کے صفحات ۱۶ سے بڑھ نہیں سکتے تھے؟۔

ویسے ہمیں کئی ایک روایات کی نہ ضرورت ہے اور نہ ہی ہمارا مطالبہ ہے، ہمارا مطالبہ تو صرف ایک صحیح، صریح، مرفوع حدیث کا ہے، یقیناً ان کئی ایک میں سے جو حدیث آپ نے پیش کی ہے سب سے زیادہ صحیح سمجھ کر ہی پیش کی ہے۔

اگر میں آپ کو قسم دُوں کہ خود ہی بتائیں کہ کیا آپ کی مستدل روایت صحیح ہے تو آپ کیا جواب دیں گے؟۔

قیامت کے دن ان وہابی عوام نے آپ کے گریبان کو پکڑا ہو گا کہ آپ تو کہتے تھے کہ ہم وہی کچھ کرتے ہیں جو اللہ کے نبی ﷺ نے کیا لیکن یہ کیا؟ آپ اس وقت ان لوگوں کو کیا جواب دیں گے؟ ہم پھر کہتے ہیں کہ پوری دنیا کے لا مذہب اکٹھے ہو جائیں اور پورے ذخیرۂ حدیث سے ایک صحیح، صریح، مرفوع، غیر محتمل حدیث پیش کریں کہ آپ ﷺ نے سینہ پر ہاتھ باندھے تھے تو منہ مانگا انعام دیا جائے گا۔

لیکن یاد رکھو!

نہ خنجر اُٹھے گا نہ تلوار تم سے   یہ بازو میرے آزمائے ہوئے ہیں

آپ کی مستدل مذکورہ حدیث کی سند امام ابن خزیمہ نے اس طرح نقل کی ہے:

" أخبرنا أبو طاهر ، نا أبو بكر ، نا أبو موسى ، نا مؤمل ، نا سفيان عن عاصم بن كليب عن أبيه عن وائل بن حجر قال .... الخ.

اس سند میں ایک راوی مومل بن اسماعیل ہے، جو کہ ضعیف ہے۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نقل فرماتے ہیں:

”قال أبو حاتم صدوق شديد في السنة كثير الخطاء وقال البخاري منكر الحديث ..... وقال غيره د فن كتبه فكان يحدث من حفظه فكثر خطاء ، قلت : قال ابن حبان في الثقات ربما أخطاء ....وقال يعقوب ابن سفيان مؤمل أبو عبدالرحمن شيخ جليل سني سمعت سليمان بن حرب يحسن الثناء كان مشيختنا يوصون به الا ان حديثه لا يشبه حديث أصحابه وقد يجب على أهل العلم أن يقفوا عن حديثه فانه يروى المناكير عن الضعفاء .... وقال الساجي صدوق كثير الخطاء وله أوهام ..وقال ابن سعد ثقة كثير الغلط وقال ابن قانع صالح يخطیء ، وقال الدارقطني ثقة كثير الخطاء ...وقال محمد بن نصر المروزي المؤمل اذا انفرد بحديث وجب أن يتوقف ويثبت فيه لأنه كان سیء الحفظ كثير الغلط۔۔۔۔

(تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۲۸۰، ص ۲۸۱، المکتبۃ الاثریہ الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور۔ الطبعۃ الاولیٰ۔)

ابوحاتم نے کہا کہ صدوق ہے، سنت کے معاملہ میں سخت اور بہت زیادہ غلطیاں کرنے والا ہے، اور امام بخاری نے کہا: منکر الحدیث ہے۔ دیگر آئمہ نے کہا کہ اپنی کتابیں دفن کردی تھیں اور حدیث حافظہ سے بیان کرتا تو بہت زیادہ غلطیاں کرتا تھا، ابن حبان نے کتاب الثقات میں کہا کہ غلطی کرتا ہے۔ یعقوب بن سفیان نے کہا کہ سنی شیخ ہے، سلیمان بن حرب اس کی تعریف کرتے، مگر ان کے بقول اس کی احادیث اس وقت کے دیگر محدثین کے مشابہ نہیں ہوتی تھیں، اور اہل علم پر واجب ہے کہ وہ اس کی روایت پر عمل نہ کریں کیونکہ یہ ضعفاء سے منکر احادیث روایت کرتا ہے، امام ساجی نے کہا: صدوق مگر زیادہ غلطیاں کرنے والا ہے اور اسکی احادیث میں اوہام ہیں۔ ابن سعد نے کہا کہ ثقہ کثیر الغلط یعنی بہت زیادہ غلطیاں کرنے

والا ہے، امام ابن قانع نے کہا: صالح ہے لیکن خطاء کرتا ہے، دارقطنی نے کہا کہ ثقہ کثیر الخطاء ہے محمد بن نصر مروزی نے کہا کہ جب مؤمل اکیلا روایت کرے تو اس کی حدیث پر عمل کرنے سے رُک جانا ضروری ہے اور اس میں یہ چیزیں ثابت ہیں کیونکہ وہ رڈی حافظے والا اور بہت زیادہ غلطیاں کرنے والا ہے۔

اور محدثین نے فرمایا کہ جس کو امام بخاری منکر الحدیث کہہ دیں اس سے روایت لینی جائز نہیں ملاحظہ فرمائیں، میزان الاعتدال وغیرہ۔

لہذا ثابت ہوا کہ یہ روایت بالکل ضعیف ہے اور ہمارا سوال ابھی تک قائم ہے۔

سوال نمبر ﴿۷﴾

کیا نبی اکرم ﷺ نے نماز میں دایاں ہاتھ بائیں کہنی پر رکھا تھا؟

جواب: ''حضرت وائل بن حجر رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی نمازیوں تھی کہ آپ ﷺ نماز کے لئے کھڑے ہوئے، قبلہ کی طرف منہ کیا تکبیر تحریمہ کہی اور کانوں تک ہاتھ اٹھائے پھر دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ کی ہتھیلی اور گھٹ اور کلائی (ساعد) پر رکھا۔

(ابوداود مع العون ۱/۲۶۵)

اقول: الحق یعلو ولا یعلی الحمد للہ رب العالمین! مجیب نے یہ حدیث نقل کر کے یہ تسلیم کرلیا ہے کہ مسلک حق اہل سنت و جماعت ہی صحیح ہیں اس حدیث کے مطابق ہاتھ باندھنے کا طریقہ اہل سنت و جماعت احناف کا ہے۔

اس مسئلہ میں مجیب واضح طور پر شکست خوردہ نظر آتا ہے اور ثابت ہوگیا کہ آج کل لامذہبوں کی اکثریت جس طرح بازو پر بازو باندھتی ہے یہ بالکل سنت کے خلاف ہے۔

مقولہ لا مذہب: ''وضاحت: ہم جب بھی نماز نبوی کو بیان کرتے اور مسلمانوں کو تعلیم

دیتے ہیں تو اس مذکورہ حدیث کی روشنی میں ہی وضاحت کرتے ہیں کہ دائیں ہاتھ کو بائیں کی ہتھیلی اور گھٹ اور کلائی پر رکھ کر سینے پر رکھا جائے۔

اقــــول : یہی تو ہمارا سوال ہے کہ سینے پہ کیوں رکھے جائیں کیا، آپ ﷺ نے سینہ پر ہاتھ باندھے ہیں؟ جو حدیث آپ نے بطور دلیل پیش کی ہے وہ تو ضعیف ومردود ہے پھر سینہ پر ہاتھ کیوں باندھے جائیں؟

اصل میں وہابی سارے کے سارے غیر مجتہد وغیر مقلد ہیں اس لئے انہیں آپ ﷺ کی تعلیم و تلقین کی ضرورت نہیں ہے، وہ شتر بے مہار ہیں جہاں جس کا جو جی چاہے کرتا پھرتا ہے، ہر گھر کا علیحدہ دین ہے۔

ہم وہابی عوام سے کہتے ہیں کہ یہ مولوی تو اس جہان میں آپ کا ساتھ چھوڑ رہے ہیں آخرت میں تو بالکل ہی منکر ہو کر کہیں گے کہ یہ وہابیوں کی اپنی غفلتیں تھیں ہم نے ان کو کوئی ایسی بات نہیں بتائی تھی۔

سوال نمبر ﴿۸﴾

ایک صحیح، صریح، مرفوع حدیث پیش کریں کہ آپ ﷺ نے پورا سال تہجد کی اذان کا حکم فرمایا ہو وہ اذان رمضان شریف میں سحری کھانے کے لئے نہ ہو بلکہ پورا سال تہجد کے لئے ہو۔

جواب : ''رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں فجر کے وقت ہر روز دو اذانیں ہی ہوا کرتے تھیں۔''

اقول : ''ہر روز دو اذانیں دینے کی کیا دلیل ہے؟

حدیث شریف کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رمضان شریف میں ہوتی تھیں۔

جب کہ حضرت علامہ امام ابوالحسن بن محمد الحافظ ابن القطان الفاسی م ۶۲۸ ھ فرماتے ہیں: ''

والحديث المذكور لا يعارضه لأنه في رمضان خاصة امام سائر العام فما كان

يؤذن الا بعد الفجر .

(بيان الوهم والايهام الواقعين في كتاب الاحكام لابن القطان ۲۷۴/۳)

اور حدیث مذکور اس حدیث کے متعارض نہیں کیونکہ یہ اذان رمضان کے ساتھ خاص ہے اور تمام سال اذان طلوع فجر کے بعد ہی ہوتی تھی، اگر یہ تہجد کے لئے ہو جیسا کہ لامذہبوں کا دعوی ہے تو پھر یہ اذان ہی ایک ایسی اذان ہوگی جو نماز کا وقت ختم ہونے پر دی جائے، حالانکہ اذان تو پہلے دی جاتی ہے، لیکن اس میں ہے کہ تہجد پڑھنے والا اب تہجد ختم کر کے سحری کے لئے گھر چلا جائے۔ اور پھر کسی نفل نماز کے لئے اذان ثابت نہیں ہے۔

علامہ عراقی رحمۃ اللہ علیہ نقل فرماتے ہیں:

'' قال ابن عبد البر وفي اجماع المسلمين على أن النافلة بالليل والنهار لا أذان لها ما يدل على أن أذان بلال بالليل انما كان لصلاة الصبح .

(طرح التثريب لأبي زرعة العراقي ۲۰۷/۲)

امام ابن عبدالبر نے فرمایا کہ اس پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے کہ نفلی نمازیں، چاہے دن کی ہوں یا رات کی، ان کے لئے اذان نہیں، تو یہ دلالت کرتا ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالی عنہ کی اذان رات کو صبح کی نماز کے لئے تھی۔

علامہ عراقی مزید فرماتے ہیں: **'' فيجعل الجمع بين الحديثين بحمل أحدهما على رمضان والآخر على غيره . (طرح التثريب لأبي زرعة العراقي ۲۱۰/۲)**

ان دونوں حدیثوں کے درمیان تطبیق (جمع) اس طرح ہو سکتی ہے کہ ایک اذان رمضان شریف میں اور دوسری سارا سال۔

اور مولوی ابوالبرکات لامذہب نے لکھا:

سوال: بعض مساجد میں تہجد کی اذان ہوتی ہے ہم ان سے کہتے ہیں کہ یہ قرآن وحدیث سے ثابت نہیں یہ استدلال پیش کرتے ہیں کہ آنحضرت نے فرمایا کہ جب حضرت بلال اذان کہیں تو تم کھاؤ پیو اور جب عبداللہ بن مکتوم اذان دیں تو تم کھانے پینے سے رک جاؤ اس میں وقت کی تعین نہیں، لہذا اسے تہجد کی اذان کہنا درست ہے۔

جواب: ''اس حدیث سے استدلال غلط ہے کیونکہ بلال کی اذان فجر کی تھی کیونکہ فجر کے وقت نیند کا غلبہ ہوتا ہے اس لئے فجر سے چند منٹ پہلے بلال کی اذان ہوتی تھی اگر یہ اذان سحری یا تہجد کی ہوتی تو فجر سے تقریبا گھنٹہ پہلے ہونی چاہیے تھی، لیکن ام المومنین عائشہ صدیقہ سے بخاری ومسلم وغیرہ کتب احادیث میں روایت موجود ہے کہ عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا فرماتی ہیں کہ دونوں اذانوں کے درمیان صرف اتنا فرق تھا کہ بلال اذان کہہ کر اترتے تھے اور حضرت عبداللہ بن ام مکتوم چڑھ کر اذان کہہ دیتے تھے اتنے فاصلے میں تہجد کیا پڑھی جاتی ہے اور سحری کا کھانا کیسے کھایا جاتا ہے۔
کسی محدث نے آج تک کتب احادیث میں تہجد یا سحری کی اذان کا باب نہیں باندھا معلوم ہوا کہ اس قسم کی اذان شریعت میں ہے ہی نہیں۔۔۔۔(فتاوی برکاتیہ ص ۲۴)

اسی طرح کا فتوی مولوی عبداللہ روپڑی کا بھی فتاوی علمائے حدیث ۲/۱۶۲۔۱۶۳ پر موجود ہے۔
جس سے معلوم ہوا کہ یہ اذان بہرحال تہجد کے لئے نہ تھی۔ باقی رہی یہ بات کہ یہ پورا سال چلتی تھی، تو ایسی روایت اگر کوئی ہے تو اس کو پیش کیا جانا چاہیے تھا۔
مذکورہ حدیث میں سحری کا ذکر ہے اور سحری مشہور تو رمضان شریف میں ہی ہے جو کہ پورے اہتمام سے ہوتی ہے نہ کہ نفلی روزوں کی کیونکہ نفلی روزوں کی سحری کا اتنا اہتمام نہیں کیا جاتا بلکہ بعض اوقات بغیر سحری کھائے روزہ رکھا جاتا تھا، جس کی نیت طلوع شمس کے بعد کی جاتی تھی،

جہاں بھی دو اذانوں کا ذکر ہے وہاں سحری کا ذکر بھی ضرور ہے اور اگر بغیر سحری کے ذکر کے کوئی باسند صحیح حدیث ہے تو لامذہبوں کو چاہیے کہ وہ پیش کریں۔

مقولہ لا مذہب: ''یہی وجہ ہے کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ ان روایتوں کے تحت فتح الباری میں لکھتے ہیں کہ دو اذانیں سارا سال ہوتی تھیں''۔

اقول: حافظ ابن حجر کی کون سی عبارت کا یہ ترجمہ ہے؟ آپ نے صرف ''وفیہ نظر'' فرمایا ہے اور اپنی طرف سے کوئی دلیل نہیں دی، جس سے واضح ہوتا ہے کہ علامہ ابن القطان کا قول راجح ہے، اور پھر اگر بالفرض محال یہ سارا سال بھی ثابت ہو تو تب بھی تہجد کے لئے تو نہیں ہو سکتی کیونکہ دونوں اذانوں کے درمیان بالکل تھوڑا وقفہ ہوتا تھا، اتنا وقفہ ہرگز ہرگز نہیں ہوتا تھا جتنا آج کل لامذہبوں کی مسجد میں ہوتا ہے، وقفہ کے متعلق مولوی ابوالبرکات کا فتوی گزر چکا ہے۔

مقولہ لا مذہب: ''ثانیا ایک ہی روایت میں دونوں اذانوں کا ذکر ہے اگر دوسری اذان آپ کے نزدیک سارا سال تھی تو پہلی اذان سارا سال کیوں تسلیم نہیں کی جاتی۔ دونوں میں فرق کرنے کی کوئی علت وشہادت نہیں ملتی''۔

اقول: اسے کہتے ہیں اجتہاد، کل کو کوئی ایسا لامذہب کہے گا کہ ایک ہی آیت میں نماز وزکوۃ کا ذکر ہے تو نماز ہر روز پانچ مرتبہ اور زکوۃ سال میں صرف ایک دفعہ کیوں؟
جناب عالی! پہلی اذان کی علت سحری کھانے کا وقت اور تہجد والے کی واپسی کا اعلان بیان کی جا رہی ہے جب کہ دوسری اذان کا مقصد نماز ہے جو کہ سارا سال ہوتی ہے جب کہ سحری بالاہتمام صرف رمضان شریف میں ہوتی ہے۔

سوال نمبر (۹)

ایک صحیح، صریح، مرفوع حدیث پیش کریں کہ نبی اکرم ﷺ نے نماز باجماعت میں بسم اللہ الرحمن

الرحیم بلند آواز سے پڑھنے کا حکم دیا ہو یا خود پڑھی ہو۔

جواب: نماز میں فاتحہ سے پہلے بسم اللہ آہستہ پڑھنا بھی درست ہے اور بلند آواز میں بھی صحیح ہے آہستہ پڑھنے والی روایت آپ کو معلوم ہے اونچی پڑھنے والی روایت سنیے۔

جناب نعیم بن مجمر نے کہا میں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی انہوں نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھی پھر ام القرآن (سورۃ فاتحہ) پڑھی جب **غیر المغضوب علیھم و الا الضالین** تک پہنچے تو آمین کہی لوگوں نے بھی آمین کہی۔۔۔ جب سلام پھیرا تو کہا مجھے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میری نماز، تم سب سے زیادہ رسول اللہ ﷺ کی نماز کے مشابہ ہے (سنن نسائی)

وضاحت: اس روایت میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نماز کا بیان ہے جس میں انہوں نے سورہ فاتحہ کی طرح بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بلند آواز سے پڑھی، نعیم بن مجمر سن کر ہی بیان کر رہے ہیں پھر صحابی رسول اللہ ﷺ نے اپنی نماز کو رسول اللہ ﷺ والی نماز قرار دیا۔

اقول: پہلے نمبر پر بات یہ ہے کہ یہ روایت صریح، مرفوع نہیں ہے جب کہ ہمارا مطالبہ صحیح، صریح، مرفوع اور غیر محتمل کا ہے، اور پھر یہ غیر محتمل بھی نہیں اس میں تشبیہ ہے جب کہ تشبیہ من کل الوجوہ نہیں ہوتی، اگر من کل الوجوہ ہے تو پھر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہی روایت ہے

عن أبي سلمة بن عبد الرحمن ان أبا هريرة كان يكبر في كل صلوة من المكتوبة وغيرها.. فيكبر حين يقوم. ثم يكبر حين يركع ثم يقول : سمع الله لمن حمده ، ربنا ولك الحمد ثم يقول : الله اكبر حين يهوى سا جدا ثم يكبر حين يرفع راسه من السجود ثم يكبر حين ... يقوم من الجلوس في الاثنتين ، ويفعل ذلك في كل ركعة حتىٰ يفرغ من الصلوة ثم يقول حين

ينصرف : والذى نفسى بيده انى لاقربكم شبها بالصلو ة رسول الله صلى الله عليه وسلم ان كا نت هذه الصلا ة حتىٰ فا رق الدنيا...... (بخارى ٨٠٣)

اب اس حدیث شریف میں **ربنا و لک الحمد** کا ذکر ہے تو اس کو بلند آواز سے پڑھا جائے گا؟ جب کہ حدیث کے آخر میں وہی الفاظ ہیں جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ کی مستدل روایت میں کہے تھے کہ مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میری نماز تم سب سے زیادہ رسول اللہ ﷺ کی نماز کے مشابہ ہے۔

اور پھر یہ روایت ویسے بھی معلول ہے جیسا کہ علامہ زیلعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے:

"**والجو اب عنه من الوجوه احد ها انه حديث معلول ، فا ن ذكر البسملة فيه مما تفرد به نعيم المجمر من بين اصحاب ابى هريرة (رضى الله عنه) وهم ثما نمائة ما بين صاحب و تا بع، ولا يثبت عن ثقة من اصحاب ابى هريرة (رضى الله عنه) انه حدث عن ابى هريرة انه عليه السلام كا ن يجهر با لبسملة فى الصلو ة . (نصب الراية ١/٣٣٦)**

اور اس حدیث کا کئی وجوہ سے جواب دیا گیا ہے، یہ کہ یہ حدیث معلول ہے۔ (یعنی اس میں کئی خفیہ علتیں ہیں جو کہ اس کو ضعیف قرار دیتی ہیں) اور اس میں بسم اللہ کا ذکر سوائے نعیم المجمر کے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے کسی بھی شاگرد نے نہیں کیا، اور آپ کے شاگردوں کی تعداد صحابہ اور تابعین میں سے آٹھ سو کے قریب ہے، اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے اصحاب میں سے کسی ثقہ راوی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نہیں کیا کہ نبی اکرم ﷺ بسم اللہ جہر سے پڑھتے تھے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

''ومما يدل على ثبوت اصل البسملة فى اول القرأة فى الصلاة مارواه النسائى وابن خزيمة وابن حبان فى صحيحهما وغيرهم من رواية نعيم المجمر قال صليت خلف ابى هريرة .... والذى نفسى بيده انى لا شبهكم صلاة برسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم .... ففى هذارد على من نفاها البتة وتائيد لتا ويل الشافعى رضى الله عنه .لكنه غير صحيح فى ثبوت الجهر لا حتمال ان يكون سماع نعيم لها من ابى هريرة رضى الله عنه حال مخا فتته لقربه منه فبهذه تتفق الروايات كلها .

(النكت على كتاب ابن الصلاح ٢/ ٧٧٠)

اوروہ جو اصل بسم اللہ کے ثبوت پر دلالت کرتا ہے نماز میں قرأۃ سے پہلے وہ جو کہ روایت کیا نسائی اورابن خزیمہ اورابن حبان نے اپنی صحیح میں نعیم المجمر کی روایت سے، انہوں نے کہا کہ میں نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی .... نماز کے بعد انہوں نے فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ میں تم سب سے زیادہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے مشابہ ہوں، پس یہ اس شخص پر رد ہے جس نے نماز میں بسم اللہ کی مطلقاً نفی کی ہے اورامام شافعی کی تاویل کی تائید میں ہے ۔لیکن جہر کے ثبوت میں صحیح نہیں ہے، اس میں یہ احتمال ہے کہ نعیم المجمر نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے قریب ہونے کی بنا پران کے خفیہ پڑھنے کے باوجود سن لیا ہو، پس اس طرح تمام روایات متفق ہوگئیں۔

اور یہ اصول ہے کہ اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال .

امام ابوبکر احمد الرازی م ۳۷۰ فرماتے ہیں:

'' اما حديث نعيم المجمر عن أبي هريرة دلالة فيه على الجهر بها لانه ذكر انه

قراها و لم يقل انه يجهر بها و جائز ان لا يكون جهر بها و ان قراها و كان علم الراوى بقراتها اما من جهة أبي هريرة باخباره اياه بذلك اومن جهة انه سمعها لقربه منه و ان لم لم يجهر بها . (احکام القرآن للجصاص ۱/۱۶)

حدیث نعیم المجمر عن ابی ہریرہ، تو اس میں جہر پر کوئی دلالت نہیں، کیونکہ راوی نے کہا کہ انہوں نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو پڑھا۔ یہ نہیں کہا کہ بلند آواز سے پڑھا، اور یہ جائز ہے کہ انہوں نے بلند آواز سے نہ پڑھا ہو اگرچہ بسم اللہ کو پڑھا ہو، اور راوی کو اس کے پڑھنے کا علم یا تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے خبر دینے سے ہوا ہو، یا اس طرح کہ وہ قریب کھڑے ہوں تو انہوں نے سن لیا ہو، اگرچہ انہوں نے بلند آواز سے نہ پڑھا ہو۔

امام ابن جوزی فرماتے ہیں:

" فجوابه ان جميع احاديثكم ضعفاف و اثبتها حديث نعيم ولا حجة فيه لانه حكى ان ابا هريرة قراها و لم يقل جهر بها فجائز أن يكون سمعها في مخافتته لقربه منه . (التحقیق لابن الجوزی ۱/۳۵۵)

تمہاری پیش کردہ ساری کی ساری حدیثیں ضعیف ہیں اور ان میں ثابت صرف نعیم المجمر والی روایت ہے لیکن وہ جہر میں صریح نہیں ہے، وہ حجت نہیں بن سکتی کیونکہ راوی نے کہا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے پڑھا، یہ نہیں کہا کہ بلند آواز سے پڑھا، ہوسکتا ہے اس نے قریب ہونے کی وجہ سے سرا پڑھتے ہوئے سن لیا ہو۔

اور اگر یہ حدیث بسم الله بالجهر میں صحیح وصریح ہوتی تو اُمت کے اکثر محدثین یہ نہ فرماتے کہ جہر بسم اللہ میں کوئی بھی حدیث صحیح ثابت نہیں ہے۔

ابن تیمیہ مؤسس اول مذہب وہابیہ نے لکھا کہ:

"وقد اتفق أهل المعرفة على انه ليس في الجهر حديث صحيح و لم يرو أهل سنن من ذلک شیئا .

اوراس پرحدیث کی سمجھ رکھنے والے سب متفق ہیں کہ جہر بسم اللہ میں کوئی بھی حدیث صحیح ثابت نہیں اوراہل سنن نے جہر بسم اللہ میں کچھ بھی روایت نہیں کیا۔

(مختصر الفتاوی المصرية ص ۴۲)

پیشوائے وہابیہ ابن قیم نے لکھا ہے کہ:

" فصحيح تلک الأحاديث غير صريح و صريحها غير صحيح .

(زاد المعاد في هدي خير العباد ۱/۱۵۵)

ان احادیث میں جو صحیح ہیں وہ جہر میں صریح نہیں اور جو صریح ہیں وہ صحیح نہیں۔

امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

" کل ما روی عن النبي ﷺ في الجهر فليس بصحيح .

(فتح القدیر ۱/۲۵۴، والتحقیق لابن الجوزي ۱/۳۵۷)

جہر میں جو کچھ بھی نبی اکرم ﷺ سے روایت کیا گیا ہے پس وہ صحیح نہیں ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ:

" لا يصح في الجهر شيء كما نقل عن الدار قطني (الدراية ۱/۱۰۵)

جہر بسم اللہ میں کوئی مرفوع حدیث صحیح نہیں، جیسا کہ امام دارقطنی سے نقل کیا گیا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بلند آواز سے نماز میں پڑھنا بدعت ہے۔

حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

عن ابن عبد الله بن مغفل قال سمعني ابي و انا في الصلوة اقول بسم الله الرحمن الرحيم فقال لي اي بني محدث اياک و الحدث قال ولم ارا احد امن

اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم كان ابغض اليه الحدث فى الاسلام يعني منه و قال و قد صليت مع النبي صلى الله عليه وسلم ومع ابى بكر و عمر ومع عثمان فلم اسمع احد منهم يقولها فلا تقلها اذا انت صليت فقل الحمد لله رب العالمين۔

یعنی مجھے میرے باپ نے نماز میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بلند آواز سے پڑھتے سنا تو فرمایا: اے میرے بیٹے! بدعت سے بچ۔ فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں ان سے زیادہ کسی کو اسلام میں نئی بات نکالنے کا دشمن نہیں دیکھا۔ انہوں نے فرمایا کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وابوبکر صدیق وعمر فاروق وعثمان غنی رضی اللہ عنہم کے ساتھ نماز پڑھی لیکن کسی کو بھی بسم اللہ پڑھتے نہیں سنا، اس لئے تم بھی اسے بلند آواز سے نہ پڑھو۔ جب نماز پڑھو تو الحمد للہ رب العالمین سے شروع کرو۔

(أخرجه الترمذي في الجامع ص ۳۳ ج ۱ لفظ له ، و ابن ماجه في السنن ۵۹ و أحمد في مسنده ج ۴ ص ۸۵ . (۱۶۹۰۹) .و ج ۵ ص ۵۴ . (۲۰۸۱۹) و ص ۵۵ (۲۰۸۳۳) و عبد الرزاق في المصنف ج ۲ ص ۸۸، وابن ابی شیبة فی المصنف ج ۱ ص ۴۴۷. ملتان)

تو اس سے معلوم ہوا کہ نماز میں بسم اللہ کو جہر کے ساتھ پڑھنا بدعت ہے کیونکہ اس کو بدعت کہنے والے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیارے صحابی حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ ہیں۔

اس حدیث شریف سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بدعتی کون لوگ ہیں۔ افسوس ہے ان لوگوں کی عقل پر جو صحابہ رضی اللہ عنہم کے عمل اور کام کو تو بدعت کہہ کر ٹھکرا دیتے ہیں اور جن امور کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بدعت کہا ہے اس پر عمل کرتے ہیں۔

الٹی ہی چال چلتے ہیں دیوانگانِ نجد   دیں کو پامال کرتے ہیں وقار کیلئے

عن ابراهيم قال جهر الامام ببسم الله الرحمن الرحيم بدعة ۔

(ابن ابی شیبه فی المصنف ج ۱ ص ۴۴۸ .ملتان)

حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ امام کا بلند آواز سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنا بدعت ہے۔

وقال بعض التا بعين الجهر بدعة .

(مرقاة شرح مشكوة ص ۵۳۰ ج ۱)

اور بعض تابعین نے کہا ہے کہ بسم اللہ شریف کا جہر کرنا بدعت ہے۔

عن ابن عباس قال الجهر ببسم الله الرحمن الرحيم قراء ة الاعراب.

ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بسم اللہ بلند آواز سے پڑھنی گنواروں کی قرأت ہے۔

(أخرجه ابن أبي شيبة في المصنف ج ۱ ص ۴۴۸ ، وعبد الرزاق في المصنف ص ۱۱۴ ج ۱ والطحاوی في شرح معاني الآثار ص ۱۴۰ ج ۱ ، و ابن عبد البر في التمهيد ج ۱۹ ص ۲۰۹ ،وفي الاستذكار ج ۱ ص ۴۵۸).

ان ابن عباس سئل عن الجهر ببسم الله الرحمن الرحيم فقال كنا نقول هي قرأة الاعراب.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نماز میں بسم اللہ کے بلند آواز سے پڑھنے کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: ہم کہتے ہیں کہ یہ گنواروں کی قرأت ہے۔

(أخرجه البزار في مسنده كما قال الهيثمي في المجمع الزوائد ص ۲۸۰ ج ۲)

امام حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا:" **سئل عن الجهر بالبسملة فقال انما يفعل ذلک الاعراب.** یعنی جہر بسم اللہ کا حکم پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ گنواروں کا کام ہے۔

(أحكام القرآن للجصاص ۱/۱۷)

پس ثابت ہوا کہ ہمارا یہ سوال ابھی تک لامذہبوں کی گردنوں پر بھاری پتھر کی طرح پڑا ہوا ہے۔

سوال نمبر (۱۰)

ایک صحیح، صریح، مرفوع حدیث پیش کریں کہ رسول اللہ ﷺ نے وفات تک رفع الیدین عند الرکوع وبعد الرکوع کیا تھا؟

جواب: اگر ہر عمل میں شرط لگا دی جائے کہ حدیث میں صراحتاً ہو کہ آپ ﷺ نے وہ عمل تا وفات کیا ہو تو یہ ایک ایسی شرط ہے جس کی وجہ سے بہت سے اعمال نبویہ کا تعلق ہماری زندگی سے ختم ہو جائے گا بلکہ دین اسلام کی اصلی شکل مسخ ہو کر رہ جائے گی۔

اقول: ہم ہر عمل کے لئے یہ شرط نہیں لگاتے، یہ شرط صرف وہاں لگائی جاتی ہے جہاں کسی عمل کے منسوخ ہونے میں اختلاف پیدا ہو جائے، چونکہ اس مسئلہ میں ہمارا دعویٰ ہے کہ رفع الیدین بعد الافتتاح منسوخ ہے اور آپ حضرات کہتے ہیں کہ یہ منسوخ نہیں۔

لہٰذا یہ قید اس واسطے ہے کہ چونکہ نماز تو آپ ﷺ نے تمام عمر پڑھی ہے، لہٰذا اگر یہ رفع الیدین منسوخ نہیں تو پھر جب تک نماز ہے اس وقت تک رفع الیدین کا ثبوت بھی ہونا چاہئے، اگر آپ ایسی روایات باسند صحیح، صریح، مرفوع، غیر محتمل پیش کر دیں تو ہمارا دعویٰ خود بخود ختم ہو جائے گا۔

لیکن اگر آپ ایسی روایت پیش نہ کر سکیں اور یقیناً نہیں پیش کر سکیں گے تو پھر ہمارا دعویٰ ثابت ہو جائے گا۔

مقولہ لا مذہب: "دوسری بات یہ ہے کہ آپ کے سوال میں "وفات تک" کے کلمات بتا رہے ہیں کہ آپ بریلوی ہو کر وفات رسول کے قائل ہیں کیا خیال ہے؟

اقول: ہم آپ ﷺ پر وفات کے وقوع کے قائل ہیں لیکن اب قبر میں آپ ﷺ کو حقیقی زندگی کے ساتھ زندہ مانتے ہیں وفات کے واقع ہونے کا کوئی سنی بھی منکر نہیں۔

ہماری کتب میں اس کی تصریح موجود ہے لیکن آپ لوگوں کی گستاخی یہ ہے کہ آپ نبی اکرم ﷺ کو قبر مبارک میں زندہ تسلیم نہیں کرتے بعد از وفات آپ کی زندگی کا منکر گمراہ ہے۔

مقولہ لا مذہب: تیسری بات یہ ہے کہ رفع الیدین کی احادیث کو روایت کرنے والے صحابہ میں سے ایک صحابی وائل بن حجر بھی ہیں، ان کی روایت صحیح مسلم میں موجود ہے، یہ صحابی ۹ ہجری کو مسلمان ہوئے حضور علیہ السلام سے تربیت لے کر اپنے علاقے کی طرف واپس چلے جاتے ہیں ایک سال بعد یعنی دس ہجری کو پھر مدینہ منورہ آتے ہیں تو صحابہ کرام اور رسول اللہ ﷺ کا رفع الیدین عند الرکوع وغیرہ کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے ہیں (دیکھئے ابوداود)۔

گیارہ ہجری کے تقریبا ابتدائی ماہ بارہ ربیع الاول میں آپ کی وفات ہو جاتی ہے، بتائیے وہ کون سی مرفوع صحیح روایت ہے۔ جس نے اسے منسوخ کر دیا؟۔

اقول: یہ حدیث بھی غیر مقلدین پر حجت ہے، یہ حدیث پوری نقل نہیں کی حضرت وائل بن حجر رضی اللہ تعالی عنہ کی حدیث میں بھی رفع الیدین بین السجدتین کا ذکر ہے، اگر مان لیا جائے کہ یہ حدیث نبی اکرم، نور مجسم ﷺ کی آخری نمازوں کے بارے میں ہے تو پھر ماننا پڑے گا کہ سجدوں میں رفع الیدین بھی ایسے ہی سنت ہے، جیسے کہ رفع الیدین عند الرکوع و بعد الرکوع سنت ہے، لیکن غیر مقلدین سجدوں میں رفع الیدین کے منکر ہیں اور اکثر اپنی کتابوں میں احادیث کانٹ چھانٹ کر پیش کر کے لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں۔

جب آپ حضرت وائل بن حجر رضی اللہ تعالی عنہ کی حدیث کے بعد یہ سمجھتے ہیں کہ دین کی تکمیل اسی نماز پر ہوئی اور اس کے بعد کوئی نیا حکم نازل نہیں ہوا تو سجدوں میں رفع الیدین کے منسوخ ہونے کا حکم کب نازل ہوا جو آپ لوگ اس کو چھوڑ بیٹھے ہیں۔

اس روایت میں رفع الیدین بین السجدتین کا ثبوت:

ابوداود میں اس روایت میں یہ الفاظ بھی مروی ہیں:

"واذا رفع رأسه من السجود أيضا رفع يديه..."۔

(سنن ابو داود ۱ ۱۱۸ (۸۲۲)

اور جب سجدوں سے سر مبارک اُٹھاتے تو بھی رفع الیدین کرتے۔

اور مسند احمد میں الفاظ اس طرح ہیں:

"قال: رأيت رسول الله ﷺ يرفع يديه مع التكبير"

(مسند احمد ۳۱۶/۴)

یعنی میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ ہر تکبیر کے ساتھ رفع الیدین کرتے تھے۔

اور سنن دارمی میں یہ الفاظ درج ہیں:

عن وائل الحضرمي، أنه صلى مع رسول الله ﷺ فكان يكبر اذا خفض واذا رفع ،و يرفع يديه عند التكبير . (سنن الدارمي ۱/ ۲۲۹، ملتان)

حضرت وائل حضرمی رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی، پس آپ ﷺ ہر اُونچ نیچ میں تکبیر کہتے اور ہر تکبیر کے ساتھ رفع الیدین کرتے تھے۔

اور دارقطنی میں یہ الفاظ درج ہیں: " انه رأى رسول الله ﷺ يرفع يديه حين يفتتح الصلوة و اذا ركع و اذا سجد".

(سنن الدارقطني ۱/۲۹۱)

یعنی انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ رفع الیدین کرتے نماز کے شروع میں اور جب رکوع کرتے اور جب سجدۃ کرتے۔

اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب "جزء رفع الیدین" میں بھی یہ الفاظ ہیں کہ:

"كان يرفع يديه اذا ركع و اذا سجد". (جزء رفع الیدین ص ۵۱ مترجم)

یعنی آپ ﷺ رکوع اور سجدوں میں رفع الیدین کرتے تھے۔

اور "سنن الكبرى للبيهقي" میں اس طرح ہے:

"قال: صليت خلف رسول الله ﷺ فلما كبر رفع يديه مع التكبير واذا ركع واذا رفع أو قال سجد. (سنن الكبرى ۱/۱۲۶)

یعنی میں نے رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی، پس جب آپ تکبیر کہتے تو تکبیر کے ساتھ ہی رفع الیدین کرتے اور جب رکوع کرتے اور جب رکوع سے سر اٹھاتے یا کہا جب سجدہ کرتے۔

مقولہ لا مذہب: صاحب ہدایہ نے ابتدائی رفع الیدین کے لئے " و اظب عليه " کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں یعنی اس رفع الیدین پر آپ ﷺ نے ہمیشگی فرمائی۔

علامہ زیلعی حنفی نے اس روایت کو واضح کر دیا جس کی طرف بطور دلیل صاحب ہدایہ نے اشارہ کیا تو وہ روایت ابن عمر رضی اللہ تعالی عنہما والی ہی تھی جس میں رفع الیدین عند الرکوع والرفع منہ کا بھی ذکر تھا۔

اقول: علامہ زیلعی رحمۃ اللہ علیہ نے مختلف مقامات میں رفع الیدین والی احادیث نقل کر کے یہ ثابت فرمایا ہے کہ بعض روایات میں عند الرکوع اور بعد الرکوع کا اثبات ہے۔

جیسا کہ ابن عمر رضی اللہ تعالی عنہما کی روایت اور بعض احادیث میں سجدوں میں رفع الیدین کا ذکر کیا گیا ہے، جیسا کہ وائل بن حجر اور مالک بن حویرث رضی اللہ تعالی عنہما کی احادیث اور بعض روایات میں رفع الیدین في السجود کی نفی اور بعض میں بعد از افتتاح کے تمام جگہوں میں رفع الیدین کی نفی۔

لیکن تمام روایات میں رفع الیدین عند الافتتاح کا ذکر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ

نے رفع الیدین عند الافتتاح پر مواظبت فرمائی ہے، لیکن غیر مقلد ایسی باتیں کیسے سمجھ سکتا ہے۔ اس نے صرف حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالی عنہما والی روایت ہی دیکھی ہے اور علامہ زیلعی پر اعتراض کر دیا۔

مقولہ لا مذہب: تعجب ہے کہ ایک ہی روایت میں تین جگہ رفع الیدین بیان ہوا وہ روایت پہلے رفع الیدین کے لئے ہمیشگی کی دلیل بن گئی اور دوسرے مقامات کے رفع الیدین منسوخ پا گئے۔ انصاف کا تقاضا تھا کہ یا تو تینوں مقامات کے رفع الیدین منسوخ قرار پاتے یا تینوں مقامات کے رفع الیدین ہمیشہ کے لئے ثابت ہو جاتے کیونکہ روایت ایک ہی ہے۔

اقول: اب لا مذہب ذہن پر یہ شعر فٹ ہوتا ہے کہ

نکتہ توحید سمجھ میں آ تو سکتا ہے ۔۔۔ تیرے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے

سوال نمبر (۱۱)

ایک صحیح، صریح، مرفوع، غیر محتمل حدیث پیش کریں کہ کپڑا ہوتے ہوئے ننگے سر نماز پڑھنے کا حکم حدیث میں ہو۔

جواب: صحت نماز کے لئے سر پر کپڑا باندھ کر رکھنے کی شرط میں نہ کوئی قرآنی آیت ہے اور نہ ہی صراحتاً رسول اللہ ﷺ کی حدیث شریف ہے، نہ ہی رسول اللہ ﷺ اس کا خصوصی اہتمام فرمایا کرتے تھے۔ جس حال میں ہوتے نماز ادا کر لیتے، یہی وجہ ہے کہ احادیث شریفہ میں آپ کا ننگے سر نماز ادا کرنا بھی آیا ہے۔

حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ تعالی عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو اس حال میں نماز پڑھتے دیکھا کہ آپ ایک ہی کپڑا اوڑھے ہوئے تھے جس کے دونوں کنارے آپ کے کندھوں پر تھے (بخاری و مسلم)

اقول: جوحدیث آپ نے پیش کی، اس سے تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ تہبند شریف کا بھی خصوصی اہتمام نہیں فرماتے تھے بلکہ ایک ہی چادر کا خصوصی اہتمام فرماتے تھے، لہٰذا لامذہبوں کو چاہئے کہ وہ بھی نماز میں تہبند وشلوار کا خصوصی اہتمام نہ کیا کریں۔

مقولہ لا مذہب: ''حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ تعالی عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا میں شکار کے لئے نکلتا ہوں تو ایک ہی قمیص میں نماز پڑھ لیا کروں تو آپ ﷺ نے فرمایا ہاں البتہ قمیص کو آگے سے بند کرلیا کرو۔ (ابوداود)

حضرت جابر رضی اللہ تعالی عنہ نے ایک کپڑے میں نماز پڑھی۔

اقول: مذکورہ احادیث سے جو نصیحت ومسئلہ دریافت ہوتا ہے اس پر تو لامذہبوں کا عمل نہیں اور جو ثابت نہیں ہوتا اس پر زور ہے یعنی تینوں احادیث میں صرف ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کا جواز ہے جس پر وہابیوں کا عمل نہیں نماز پڑھتے ہوئے یہ لوگ شلوار، قمیص، بنیان، جرابیں وغیرہ کئی کپڑے پہنے ہوتے ہیں، ہم نے آج تک کسی لامذہب وہابی کو نہیں دیکھا کہ وہ شلوار اُتار کر صرف قمیص میں یا قمیص وشلوار اُتار کر صرف ایک چادر کو لپیٹ کر نماز پڑھ یا پڑھا رہا ہو، حالانکہ مذکورہ بالا احادیث اس میں واضح ہیں اور ان میں ننگے سر کا ذکر نہیں لیکن اس پر لامذہبوں کا بڑا زور وشور ہوتا ہے، ویسے بھی ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کا حکم ومعمول منسوخ ہے۔ تفصیل ملاحظہ فرمائیں:

ننگے سر نماز پڑھنا

مولوی محمد اسماعیل سلفی (لامذہب) غیر مقلد کا فتوی

سوال: بدن پر کپڑے ہوتے ہوئے سر پر سے ٹوپی یا پگڑی اتار کر رکھ دینی اور کوئی عذر بھی نہ ہو اور ہمیشہ اس طرح نماز پڑھنا اگرچہ فرض نماز باجماعت مسجد میں ہو اس کا شرعا کیا حکم ہے؟

کیا اس طرح نبی علیہ الصلوۃ والسلام یا صحابہ سے ثبوت ملتا ہے؟ اگر ملتا ہے تو عبارت مع صفحہ تحریر فرمادیں۔

(۲) ننگے سر نماز پڑھنی افضل ہے یا سر ڈھانک کر، اگر سر ڈھانک کر نماز پڑھنی افضل ہے تو اس کی دلیل پیش فرمائیے گا؟۔ (عبداللہ خطیب جامع مسجد اہل حدیث ڈیرہ غازی خان)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب: وباللہ التوفیق! متذکرہ صدر سوال پر تین وجوہ سے غور کیا جاسکتا ہے۔

(۱) مطلق جواز اور اباحت کے لحاظ سے

(۲) افضلیت یعنی آنحضرت ﷺ اور صحابہ کے عام عمل کے لحاظ سے۔

(۳) حرمت اور عدم جواز کے لحاظ سے۔

نماز میں ستر مغلظ (شرمگاہ) کا ڈھانپنا بالاتفاق ضروری ہے ان میں سے اگر کوئی حصہ ننگا ہو تو نماز نہیں ہوگی اور ان اعضاء کو ننگا رکھنا شرعا حرام ہے، بہز بن حکیم سے مروی ہے:

'' **احفظ عورتک الا من زوجتک او ما ملکت یمینک** . (رواہ الخمسۃ الا النسائی)

بیوی اور مملوکہ کے سوا اعضاء ستر دیکھنے کا کسی کو موقع نہ دے۔

شوکانی فرماتے ہیں: '' **والحق وجوب ستر العورة في جميع الأوقات الا وقت قضاء الحاجة واقضاء الرجل الى أهله** . اھ (نیل الأوطار ج۲ ص۶۴)

حد ستر میں اہل علم مختلف ہیں جمہور ناف سے گھٹنہ تک ڈھکنا ضروری سمجھتے ہیں بعض صرف ران ڈھانپنا واجب سمجھتے ہیں۔ امام احمد اور امام مالک سے ایک روایت میں آیا ہے '' **العورة القبل والدبر** '' (نیل الأوطار ج۲ ص۶۴) غرض ستر کی جو حد بھی اہل علم کے نزدیک ہے اگر اسے ننگا رکھا جائے تو نماز نہیں ہوگی۔ اعضاء ستر کو ویسے بھی ننگا رکھنا درست نہیں۔ نماز میں تو قطعاً حرام و

ناجائز ہوگا۔ سر چونکہ بالاتفاق اعضاء ستر میں نہیں اس لئے اگر کسی وقت ننگے سر نماز پڑھی جائے تو نماز بالاتفاق جائز ہوگی۔ اس کے لئے نہ بحث کی ضرورت ہے نہ احادیث کی ٹٹول کی ضرورت۔

جس طرح کوئی پنڈلی، پیٹ، پشت وغیرہ اعضاء ننگے ہوں تو نماز جائز ہے۔ سر ننگے بھی درست ہے۔ لیکن اسے عادت نہیں بنانا چاہیے۔

امام اگر نماز کے بعد پاؤں آسمان کی طرف کرے یا مقتدی کوئی ایسی حرکت کریں، حدیث میں اس سے رکاوٹ ثابت نہیں ہوگی۔ لیکن عقل مند ایسا کرنے سے پرہیز کرے گا۔ ننگے سر کی عادت بھی قریباً اسی نوعیت کی ہے۔ جو اس کے باوجود ایسی عادات عقل وفہم کے خلاف ہیں۔ عقلمند اور متدین آدمی کو اس سے پرہیز کرنا چاہیے۔

آنحضرت، صحابہ کرام اور اہل علم کا طریق وہی ہے جو اب تک مساجد میں متوارث اور معمول بہا ہے۔ کوئی مرفوع حدیث صحیح میری نظر سے نہیں گزری جس سے اس عادت کا جواز ثابت ہو، خصوصاً باجماعت فرائض میں، بلکہ عادت مبارک یہی تھی کہ پورے لباس سے نماز ادا فرماتے تھے۔

امام بخاری فرماتے ہیں: باب وجوب الصلوة في الثياب وقول الله تعالى خذو زينتكم عند كل مسجد و من صلى ملتحفا في ثوب واحد و يذكر عن سلمة بن الأكوع ان النبي ﷺ قال بزك و لو بشركة في اسناده نظر الخ.

(صحيح بخاری مع فتح مطبوعه مصر ج ۱ ص ۳۱۸)

امام بخاری کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ زینت کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ اعضاء ستر ڈھانپنے کے علاوہ اچھے کپڑوں میں ادا کی جائے۔ عام ذہن کے لوگوں کو اس قسم کی احادیث سے غلطی لگی ہے۔ کہ ایک کپڑے میں نماز ادا کی جائے تو سر ننگا رہے گا۔ حالاں کہ ایک کپڑے کو اگر پوری

طرح لپیٹا جائے تو سر ڈھکا جا سکتا ہے۔

اس مضمون کی احادیث ام ہانی، ابوہریرہ، جابر بن عبداللہ، سلمہ بن اکوع، عمر بن ابی سلمہ، طلق بن علی وغیرہ سے صحیح بخاری، سنن ابی داؤد وغیرہ دواوین سنت میں موجود ہیں لیکن کسی میں سر ننگا رکھنے کا ذکر نہیں۔ خصوصاً جس میں عادت اور کثرت عمل ثابت ہو، پھر احادیث میں آنحضرت ﷺ کے ارشاد سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صورت یا تو صرف اظہار جواز کے لئے ہے۔ یا کپڑوں کی کم یابی کی وجہ سے۔ ان حالات سے جواز یا اباحت تو ثابت ہوسکتی ہے۔ سنت یا استحباب ظاہر نہیں ہوتا۔ حضرت ابوہریرہ کی روایت میں ہے: "او لكلكم ثوبان (ابوداؤد ص ۲۴۰) طلق کی روایت میں ہے: "او لكلكم يجد ثوبين" (ابوداؤد مع عون ج ا ص ۲۴۱) کیا سب کو دو کپڑے میسر آسکتے ہیں۔

حضرت عمرؓ کے اثر میں مزید تفصیل ملتی ہے، حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں:

قام رجل الى النبي ﷺ فسئله عن الصلوة في الثوب الواحد فقال او كلكم يجد ثوبين ثم سئل عمر فقال اذا وسع الله فاوسعوا جمع رجل عليه ثيابه صلى رجل في ازار و رداء في ازار وقميص في ازار وقباء في سراويل و رداء في سراويل وقميص في سراويل وقباء في تبان وقباء في تبان وقميص قال و احسبه في تبان ورداء. (صحیح بخاری ص ۲۶۴)

حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ سے ایک آدمی نے ایک کپڑے میں نماز کے متعلق دریافت کیا حضرت عمرؓ نے فرمایا: جب اللہ تعالی وسعت دے تو نماز میں بھی وسعت سے کام لینا چاہیے اس کے بعد حضرت عمرؓ نے حسب استطاعت نماز میں لباس کی مختلف قسموں کا ذکر فرمایا۔ حضرت عمر کا ارشاد حکم ہو یا صرف خبر اس میں کپڑوں کی قلت اور عدم استطاعت صراحۃ سمجھ میں آتی ہے اور

یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر پورے کپڑے میسر ہوسکیں اور کوئی مانع نہ ہوتو تکلف سے مسکنت کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔

ابن منیر فرماتے ہیں: ''الصحيح انه كلام في معنى الشرط كانه قال ان جمع رجل عليه ثيابه فحسن اھ (فتح ج ۱ ص ۳۲۴)

اگر ایک سے زائد کپڑے نماز میں استعمال کرے تو بہتر ہے۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''وفي هذ الحديث دليل على وجوب الصلوة في الثياب لما فيه من ان الاقتصار على الثوب الواحد كان لضيق الحال وفيه ان الصلوة في الثونين افضل من الثوب الواحد وصرح القاضي عياض بنفي الخلاف في ذلک اھ۔ (فتح الباری ا ص ۳۲۴)

اس حدیث سے ثابت ہوا ہے کہ (مستطیع کے لئے) زیادہ کپڑوں میں نماز پڑھنا واجب ہے۔ کیوں کہ ایک کپڑے کی اجازت صرف ضیق کی وجہ سے تھی اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے۔ کہ نماز میں دو کپڑے استعمال کرنا افضل ہے۔ غرض کسی حدیث سے بھی بلا عذر ننگے سر نماز کو عادت اختیار کرنا ثابت نہیں، محض بے عملی یا بد عملی یا کس کی وجہ سے یہ رواج بڑھ رہا ہے۔ بلکہ جہلاء تو اسے سنت سمجھنے لگے ہیں۔ العیاذ باللہ۔

اس کی تائید دوسری حدیث سے بھی ہوتی ہے ابن عمرؓ آں حضرت ﷺ سے ذکر فرماتے ہیں۔
اذا صلى احدكم فلياتزر وليرته. ا ھ۔ (سنن کبرے ج ۲ ص ۲۳۵)

نافع فرماتے ہیں عبداللہ بن عمر مرفوعاً فرماتے ہیں: اذا صلى احدكم فليلبس ثوبيه فان الله عزوجل احق ان يرين له' الخ (سنن کبرے)

نافع فرماتے ہیں عبداللہ بن عمر نے مرفوعاً فرمایا نماز دو کپڑوں میں پڑھو۔ اللہ کی بارگاہ میں زینت سے حاضر ہونا زیادہ مناسب ہے۔ نافع فرماتے ہیں میں ایک دن اونٹوں کی گھاس کے سلسلہ میں نماز سے پیچھے رہ گیا، عبداللہ بن عمر آئے تو میں ایک ہی کپڑے میں نماز پڑھ رہا تھا حضرت عبداللہ نے فرمایا کیا تمہارے پاس دو کپڑے نہیں؟ میں نے عرض کیا، دو ہی موجود ہیں آپ نے فرمایا: ''أرئيت لو بعثتک الى بعض أهل المدينة أكنت تذهب في ثوب واحد ؟ قلت لا قال فالله أحق ان يتجمل له ؟ الخ (بیہقی سنن ا ص ۲۳۶) اگر میں مدینہ میں کسی کے پاس تمہیں بھیجتا تو تم ایک کپڑے میں جاتے؟ میں نے عرض کیا نہیں فرمایا اللہ کی بارگاہ میں زینت سے حاضر ہونا زیادہ مناسب ہے۔

ان احادیث میں سر ڈھانپنے کی صراحت نہیں لیکن دو کپڑوں سے سر ڈھانپنے کا زیادہ امکان ہوجاتا ہے۔ کپڑا موجود ہوتو سر ننگے نماز ادا کرنا یا ضد سے ہوگا یا قلت عقل سے۔ نیز یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ اچھے کپڑوں کے ساتھ تجمل سے نماز پڑھنا مستحب اور مسنون ہے۔ آیت خذوا زينتكم کے مضمون سے بھی اسی سے وضاحت ہوجاتی ہے۔

ابوداود میں ایک اثر ہے جس سے شاید کوئی کم سواد آدمی استدلال کرے۔ حدثنا عبد الله بن محمد الزهري ثنا سفيان بن عيينة قال رات شريكا صلى بنا في جنازة العصر فوضع قلنسوته بين يديه يعني في فريضة. (ابوداود ج ا ص ۲۵۶ مع عون)

یعنی شریک نے فرضوں کی نماز بوقت عصر ٹوپی اُتار کر پڑھی اور ٹوپی اپنے سامنے رکھی۔ اھ اول تو یہ نہ مرفوع حدیث ہے۔ نہ کسی صحابی کا اثر۔ دوم معلوم نہیں، یہ شریک کون بزرگ ہیں شریک بن عبداللہ نخعی تبع تابعی ہیں یا شریک بن عبداللہ بن ابی نمر تابعی۔

ان دونوں میں کم وبیش ضعف ہے۔ لیکن یہ ان کا عمل ہے جو کسی طرح بھی قابل حجت نہیں۔

سوم امام ابوداؤد نے اسے باب الحظ اذا لم یجد عصا میں ذکر فرمایا ہے۔ جس سے ظاہر
ہے کہ یہاں ضرورتا سرننگا رکھا گیا ہے کیوں کہ جب انہیں سترہ کے لئے کوئی چیز نہ ملی تو انہوں نے
سترہ کا کام ٹوپی سے لے لیا۔ ضرورت اور عذر سے سرننگا رکھا جائے تو اس میں بحث نہیں، بحث
اس میں ہے کہ فیشن اور عادت کے طور پر نماز میں سرننگا رکھنا کہاں تک درست ہے؟ حافظ عینی
نے شرح بخاری میں مختلف مذاہب کے ذکر میں تفصیل سے کام لیا ہے۔ ان کی بحث کا خلاصہ بھی
یہی ہے کہ ایک کپڑے میں درست ہے لیکن جب وسعت ہو کپڑے میسر آسکیں تو پھر ایک پر
اقتصار مستحسن نہیں۔

حافظ ابن قدامہ مقدسی فرماتے ہیں الفصل الثانی في فضيلة وهو ان يصلي في ثوبين
او اكثر فانه اذا بلغ في الستر يروى عن عمرؓ انه قال اذا وسع الله فاوسعوا . اھ
(ص ۶۲۱) مغنی ابن قدامہ مع الشرح یعنی فضیلت اس میں ہے کہ دو یا دو سے زیادہ کپڑوں میں
نماز ادا کرے کیوں کہ اس میں ستر اور پردہ زیادہ ہوگا۔ حضرت عمر کا ارشاد ہے۔ جب اللہ مال
میں وسعت فرمائیں تو آدمی کو وسعت سے کام لینا چاہیے اس کے بعد تمیمی کا قول ذکر فرمایا ہے۔
الثوب الواحد يجزى والثوبان احسن والاربع اكمل قميص و سراويل و
عمامة و ازار" اھ۔ (ابن قدامہ اص ۶۲۱) ایک کپڑا جواز نماز کے لئے کافی ہے دو کپڑے بہتر
ہیں چار ہوں تو نماز اور کامل ہوگی۔ قمیص، پاجامہ، پگڑی اور ازار۔

ان تمام گزارشات سے مقصد یہ ہے کہ سرننگا رکھنے کی عادت اور بلاوجہ ایسا کرنا اچھا فعل نہیں۔ یہ
عمل فیشن کے طور پر روز بروز بڑھ رہا ہے۔ یہ اور بھی نامناسب ہے۔

آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں پگڑی کے متعلق تحنیک کا رواج تھا یعنی پگڑی کا ایک لپیٹ گردن
کے نیچے سے باندھتے تھے آج کی عربی پگڑیاں اور ہماری پگڑیاں اس وقت کی پگڑیوں سے وضع

میں مختلف ہیں ایسی پگڑی کا اتارنا اور بھی مشکل معلوم ہوتا ہے۔ وللتفصيل وقت اخر . ویسے
یہ مسئلہ کتابوں سے زیادہ عقل و فراست سے متعلق ہے اگر اس جنس لطیف سے طبیعت محروم نہ ہو،
تو ننگے سر نماز ویسے ہی مکروہ معلوم ہوتی ہے۔ ضرورت اور اضطرار کا باب اس سے الگ ہے۔
والسلام (فتاویٰ علماء حدیث ج ۴ ص ۲۸۶ تا ۲۸۹)

ایک اور بہت بڑے لامذہب مولوی محبّ الدین راشدی سندھی نے لکھا ہے

"بعض حضرات اس حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں جس میں یہ وارد ہے کہ اللہ تعالیٰ کے
رسول اللہ ﷺ نے ایک کپڑے میں نماز پڑھی اور اس میں ٹوپی وغیرہ بھی داخل ہے یعنی بغیر سر
ڈھانپے نماز پڑھی۔

اولا: یہ اس وقت کی بات ہے جب کپڑوں کی تنگی تھی اور اتنی فروانی نہ ہوتی تھی جیسا کہ حضرت
جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ایک کپڑے میں نماز پڑھنے پر اعتراض کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ
آنحضرت ﷺ کے زمانہ مبارک میں ہم میں سے ہر ایک کے پاس دو تین کپڑے نہ تھے۔ اسی
طرح صحیح حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ سے کسی نے دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم میں
سے ہر ایک کے پاس دو کپڑے ہیں؟

اس سے جو بات نکھر کر سامنے آجاتی ہے وہ اہل علم سے مخفی نہیں۔

ثانیا: میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کے جواز کے ثبوت سے اس کا
نزلہ یہ حضرات صرف ٹوپی پر ہی کیوں گرانے پر مصر ہیں۔ اگر ننگے سر نماز پڑھنے کے مسنون
ہونے کا مدار آپ حضرات ایک کپڑے میں نماز پڑھنے والی حدیث پر ہی رکھتے ہیں تو بسم اللہ
آپ گھر سے ہی کریں اور اس طرح نماز بھی پڑھ لیں۔ یہ اچھی ستم ظریفی ہے کہ گھر سے تو قمیص،
شلوار، کوٹ وغیرہ پہن کر آتے ہیں اور مسجد میں داخل ہونے کے بعد صرف پگڑی یا ٹوپی اتار کر

نماز پڑھنے شروع کر دی۔ کیا آپ حضرات کے نزدیک اس کا معنی و مطلب یہ ہے کہ اور تو سب کپڑے پہنے ہونے چاہئیں صرف ٹوپی وغیرہ کو اتار دیا جائے لیکن یہ مطلب سراسر غلط ہے۔

شاید کچھ لوگ کہنے لگیں کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا حکم ہے کہ مسجد میں زینت پکڑو یعنی لباس پہنو اور جب آج کپڑوں کی فراوانی ہے تو ہم یہ سارا لباس زیب تن کرتے ہیں لیکن سر کو ننگا رکھتے ہیں۔

لوگوں کی خدمت میں باادب عرض ہے کہ اگر دوسرے کپڑے زینت میں داخل ہیں تو ٹوپی وغیرہ کو آپ کس دلیل سے اس زمرہ میں سے نکال باہر کر رہے ہیں۔ اوپر صفحات میں ہم ثابت کر آئے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کا اکثر و بیشتر معمول سر کو ڈھانپنا تھا لہذا میں ٹوپی وغیرہ سے سر ڈھانپنے کے زینت ہونے پر اور کیا مضبوط ثبوت پیش کر سکتا ہوں۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے رسول ﷺ کا پسندیدہ معمول اعلیٰ درجہ کی زینت بھی ہے اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ بھی۔

بہر حال ان وجوہات کی بناء پر مجھے تو نماز کی حالت میں اور عام حالت میں سر ڈھانپنا ہر حال میں بہتر و اولیٰ اور مستحب و مندوب نظر آتا ہے۔ اگر کسی اہل علم نے اس پر تعاقب فرمایا کہ میری اس کاوش کو غیر صحیح ثابت کر دیا اور بات سمجھ میں آ گئی تو انشاء اللہ تعالیٰ رجوع بھی کر لوں گا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ ہمارا سوال ابھی تک لا جواب ہے۔

سوال نمبر (۱۲)

ایک صحیح، صریح، مرفوع حدیث پیش کریں جس میں نماز میں دو، دو فٹ کھلے پاؤں کر کے کھڑے ہونے کا حکم ہے؟

جواب: یہ محض مبالغہ ہے۔ ہم نے کبھی بھی ایسا نہیں کہا اور بیان کیا۔ کوئی شخص بے خبری میں ایسا کرتا ہے تو درست نہیں کرتا۔۔۔ البتہ ہم تو اپنے مقتدیوں کو یوں کہتے ہیں کہ دو قدموں کے درمیاں اس قدر فاصلہ رکھو کہ ساتھ والے نمازی سے کندھا بھی مل جائے کیونکہ صحابہ کرام رسول

اللہ ﷺ کے پیچھے یوں ہی نماز کے لئے صف بندی کرتے اور کھڑے ہوتے تھے۔

الحمد للہ ہمارے نمازی اس طرح یعنی حدیث کے مطابق کھڑے ہوتے ہیں، مقلدین کی طرح نہیں کہ جماعت میں کھڑے ہو کر بھی اس طرح دور دور رہتے ہیں جیسے ایک دوسرے کے دشمن مجبوراً کھڑے ہوں۔

باقی رہا اکیلا نمازی تو اس کے لئے شرعاً کوئی پابندی نہیں کہ وہ دو قدموں کے مابین کتنا فاصلہ رکھے۔ اگر آپ کے پاس کوئی مرفوع، صحیح، صریح روایت ہو تو پیش کریں؟

اقول: الحمد للہ رب العالمین! یہاں پر بھی لا مذہب غیر مقلد نے شکست تسلیم کر لی اور واضح طور پر تسلیم کر لیا کہ ہم نے وہابیوں کو اس کا حکم نہیں کیا بلکہ وہ جاہل خود ہی اس پر عمل کر کے اپنی عاقبت خراب کر رہے ہیں۔

جہاں تک مبالغہ کا تعلق ہے تو ہم عرض کریں گے کہ آپ لوگ تجربہ کر کے دیکھ لیں، بعض نہیں بلکہ اکثر وہابی اتنے ہی چوڑے پاؤں کر کے کھڑے ہوتے ہیں جتنے ہم نے سوال میں بیان کیا ہے۔

اللہ کے فضل و کرم سے ہمارے سارے سوالات ابھی تک جواب طلب ہیں اور ہمارا اب بھی یہ دعویٰ ہے کہ کوئی لا مذہب غیر مقلد وہابی ان کے جوابات صحیح، صریح، مرفوع حدیث سے پیش نہیں کر سکا اور نہ ہی کبھی کر سکے گا۔

اب آخر میں ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ مجیب غیر مقلد نے جو سوالات اہل سنت احناف پر وارد کئے ہیں صرف ہمارے اُصول سے ناواقفیت کی وجہ سے کئے ہیں۔

پہلے وہ کتب اصولِ فقہ کو پڑھے اور احناف کے اصول دیکھ کر سوال کرے ہم ان شاء اللہ اس کی تشفی فرما دیں گے۔

〈نوٹ〉

دین اسلام میں چار مذاہب اسلاف واخلاف میں مشہور ومعروف ہیں حنفی ، مالکی ، شافعی، حنبلی۔ چونکہ موجودہ دور کے غیر مقلدین ان میں سے کسی مذہب کے ساتھ نہ صرف یہ کہ تعلق نہیں رکھتے بلکہ اس تعلق کو بدعت وشرک کہتے ہیں اس لئے اہل عرب ان کو ''لا مذہب'' کہتے ہیں، لہٰذا میں نے بھی ان کو اسی نام سے لکھا ہے۔

خاکپائے علمائے اہل سنت وجماعت:

محمد عباس رضوی

واہنڈو، تحصیل کامونکی، ضلع گوجرانوالہ۔

رؤیداد مناظرہ وضع الیدین

مؤرخہ 28/12/2010

صاحبزادہ محمد قاسم مجددی

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم .

اللہ رب العالمین جل جلالہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اُس نے حسبِ سابق حق کو فتح ونُصرت عطا فرمائی ہُوا یُوں کہ ایک ساتھی محمد زاہد صاحب کو حافِظ آباد کے وہابیوں نے کسی طرح چالاکیوں، فریب کاریوں اور کذب بیانیوں سے اپنے گمراہی وضلالت کے جال میں پھنسا لیا، تقریباً دو (۲) سال کا عرصہ ان پر خُوب محنت کی، اور انہیں پُوری طرح جکڑ کر وہابیت کی بھینٹ چڑھا دیا۔

لیکن اللہ تعالیٰ جسے ہدایت عطا فرمانا چاہے اُسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا، زاہد صاحب کے لئے جب راہ ہدایت ہموار ہوئی تو وہ حافظ آباد شہر کے فاضِلِ نوجوان علاّمہ قاری محمد اجمل چشتی صاحب کے توسُّط سے فاضلِ نوجوان مناظرِ اہلِ سنت حضرت مولانا قاری محمد ارشد مسعود اشرف چشتی صاحب کے پاس آئے، قاری صاحب نے جب انہیں حقائق سے آگاہ کیا تو وہ حیرت کے باعث ان کا مُنہ تکنے لگے اور انہیں وہابیت سے نفرت ووحشت محسوس ہونے لگی۔

مگر جب وہ واپس حافظ آباد گئے تو ثناء اللہ وہابی، نجدیوں کے خطیب (حافظ آبادی) نے انہیں وہابیت پر قائم رکھنے کے لئے پُورا زور صرف کیا لیکن ہدایت زاہد صاحب کا مُقدر بن چکی تھی۔

جب وہابیوں کو خطرہ لاحق ہوا تو وہ بھاگے اپنے کسی نام نہاد مولوی، مناظر، مُحقّق کی طرف تاکہ وہ حقائق وواقعات کا چہرہ بگاڑے اور وہابیت کا دفاع کرے اور ان کی ناک کٹنے سے محفوظ رہ جائے۔

بالآخر 27 دسمبر 2010ء بروز سوموار قاری محمد اجمل چشتی (اہل سنت)، ثناء اللہ (وہابی) چند افراد کی معیت میں زاہد صاحب کو لے کر قاری صاحب کے پاس جامع مسجد نُور محلہ سید پاک، دُھلے گوجرانوالہ پہنچ گئے۔ بحث وتمحیص کا سلسلہ چلتا رہا اور جُوں جُوں بات آگے بڑھتی چلی گئی دلائل وحوالہ جات دیکھ کر تُوں تُوں زاھد صاحب کو یقین ہوتا گیا کہ اہلِ سنت برحق ہیں جبکہ وہابی

نجدی، غیر مُقلِد ولا مذہب انگریز کی پیداوار جُھوٹے، کذّاب، مکّار اور دھوکہ باز ہیں۔

کیونکہ وہابیوں نے دھوکہ بازی سے خُوب کام چلاتے ہوئے زاہد صاحب کے دل میں بٹھا دیا تھا کہ سُنّی مُشرک ہیں، نبیوں اور ولیوں کو خُدا کے ساتھ ملاتے ہیں، یہ بدعتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

در حقیقت یہ وہابیوں کی چالیں ہیں لوگوں کو ورغلانے کے لئے اور یہ ایسے ہی گھناؤنے انداز بناتے ہیں لیکن نام قرآن وحدیث کا لے کر ناواقِف لوگوں کے سامنے غلط تراجم ومفاہیم کے ساتھ آیات واحادیث پیش کر کے ان کے ایمانوں سے کھیلتے ہیں۔ عوام النّاس سادہ لوح ہونے کی وجہ سے ان کے داؤ، فریب کو نہیں سمجھتے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان کا شکار ہو جاتے ہیں لیکن اللہ عزّ وجل جس کو چاہے ہدایت عطا فرماتا اور اس کے لئے اسباب پیدا فرما دیتا ہے۔

زاہد صاحب کو گوجرانوالہ اور حافظ آباد کے وہابیوں نے ہر طرح واپس کھینچنے کی کوشش کی، لیکن آنکھ سے دیکھ کر کوئی بھی زہر نہیں کھاتا، زاہد صاحب نے ان کو کہا کہ اگر تم لوگ سچے ہو تو قاری صاحب سے بات کرو اور جو دلائل وہ پیش کر رہے ہیں ان کے جواب دو! لیکن مولوی ثناء اللہ وغیرہ ہر بات پر جب لاجواب ہو جاتے تو کہتے کہ یہاں پر ہماری کتابیں نہیں ہیں، قاری صاحب کہتے کہ کتاب کا نام لو میں دیتا ہوں لیکن وہ صرف یہی کہتے رہے کہ ہماری کتابیں یہاں نہیں جن پر ہم نے نشان لگائے ہوئے ہیں۔ پھر وہابیوں کے مولوی ثناء اللہ نے پلٹا کھایا اور کہنے لگا کہ ہم سے مناظرہ کر لو فلاں، فلاں موضوع پر جس کے جواب میں قاری صاحب نے کہا کہ ثناء اللہ ابھی تو تمہارا لکھا ہوا پہلا دعوٰی بھی ہمارے پاس موجود ہے جو 2005ء میں تم نے لکھ کر دیا اور پانچ سال ہو گئے ہیں تم اس پر بھی بات کرنے کے لئے نہیں آئے۔ اب نیا دعوٰی لکھ کر دوبارہ کتنے سال غائب رہو گے اور اس کے ہاتھوں کا لکھا ہوا سینہ پر ہاتھ باندھنے کے بارے میں دعوٰی قاری اجمل صاحب سے لے کر اسے دکھا دیا۔ جس پر وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگا اور کہنے

لگا کہ ہمارے پاس قُرآن واحادیث کا اس بارے میں ایک ذخیرہ موجود ہے، ہم صُبح ہی اس پر مناظرہ کریں گے۔ جس پر قاری صاحب نے کہا کہ تم لوگ صبح کی بات کرتے ہو یہ قیامت تک تم سے ثابت نہیں ہو سکے گا جس پر وہ کہنے لگے کہ ہم تو ثابت کریں گے لیکن آپ اس بارے میں اپنا مؤقف بھی ثابت کریں جس پر یہ طے ہوا کہ وہابی پہلے اپنا دعوٰی ثابت کریں گے اگر ثابت ہو جائے تو اہلِ سنت لکھ کر دیں گے کہ وہابیوں نے اپنا دعوٰی ثابت کر دیا ہے اور اگر ثابت نہ کر سکیں تو اہلِ سُنّت اپنا دعوٰی ثابت کریں گے جس پر وہابیوں کو بھی لکھ کر دینا ہوگا کہ اہلِ سُنّت نے اپنا دعوٰی ثابت کر دیا ہے اور ثناء اللہ وہابی کی بے سروپا گفتگو کے نتیجہ میں یہ بھی لکھا گیا کہ جو مناظر ثابت نہ کر سکا اُس کی ناک کاٹ دی جائے گی۔

پس صبح کی نماز پڑھنے کے لئے حافظ آباد سے آئے ہوئے وہابی گوجرانوالہ کے علاقہ گلہ حمید والا سید پاک بازار صدّیقِ اکبر ٹاؤن ڈھلے میں واقع وہابیوں کی مسجد توحید میں چلے گئے اور اپنے ہمنواؤں کے پاس جا کر آہ وفریاد کی اور پھر انہیں ساتھ ملا کر مناظر تلاش کیا اور محمد ایّوب بٹ صاحب کے ذریعہ قاری صاحب کو تقریباً 10:30 یا 11:00 بجے کے قریب فون پر مناظرہ کرنے کی اطلاع بھجوائی، قاری صاحب نے بھی موقع ضائع نہ کیا اور ان کا یہ چیلنج بھی قبول کر لیا 28 دسمبر بروز منگل تقریباً ایک بجے دوپہر مناظرہ شروع ہو گیا۔

وہابیوں نے عُمر صدیق نامی شخص کو اپنا مناظر بنایا جبکہ اہل سنت کی جانب سے حضرت مولانا قاری محمد ارشد مسعود اشرف چشتی صاحب ہی مناظر تھے جبکہ مناظرِ اسلام، ترجمانِ اہلِ سنت حضرت علّامہ مولانا پیر ابو الحقائق غلام مرتضیٰ ساقی مجددی صاحب دامت برکاتہم العالیہ بھی تشریف فرما تھے۔ دونوں طرف سے دعوے پہلے ہی لکھے جا چکے تھے اور بحث کا دائرہ بھی مُقرر کیا جا چُکا تھا۔

وہابیوں نے اپنا دعوٰی لکھا تھا کہ رسول اللہ ﷺ (نماز میں) بایاں ہاتھ نیچے دایاں ہاتھ اوپر سینے پر

باندھتے تھے، ہم اپنا دعوٰی قُرآن اور صحیح، مرفوع، صریح احادیث سے ثابت کریں گے۔

جبکہ اہلِ سُنّت کی طرف سے قاری صاحب نے لکھا تھا کہ: ''احناف (نماز میں) ناف کے نیچے ہاتھ باندھتے ہیں جس پر ان کے پاس صحیح وحسن احادیث دلیل ہیں، ہم اپنے اس دعوٰی کو ثابت کریں گے، ان شاء اللہ۔

اور یہ بھی لکھا گیا تھا کہ اگر وہابی سینہ پر ہاتھ باندھنا ثابت نہ کر سکے تو اہلِ سنت تحت السرة (زیر ناف) ثابت کریں گے۔۔۔ اصل عبارت وہابیوں کے مناظر عُمر صدیق نے بھی پڑھ کر سُنائی جو ویڈیو میں موجود ہے۔

اب ظاہر ہے کہ پہلے سے لکھی ہوئی تحریر کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مناظرہ کے دوران دونوں فریق اس بات کے پابند ہوں گے جو لکھ دی گئی ہے یعنی اس میں دونوں مناظروں کی گفتگو کا ایک دائرہ مُقرّر ہو جاتا ہے اور اگر کوئی اس کی مخالفت کرے تو اس کی شکست تسلیم کی جاتی ہے اس بات کو وہابی حضرات نے بھی کئی مناظروں میں تسلیم کیا ہے۔ لیکن ہوا کیا؟

پہلے تو وہابی مناظر نے ناک کاٹنے والی بات کو ختم کروانے کی کوشش کی تا کہ میری ناک قلم ہونے سے بچ جائے پھر اِدھر اُدھر کی مارنے لگا کہ دعوٰی دونوں طرف سے ہیں اور اُصُول یہ ہے وُہ ہے لہٰذا آپ بھی اپنا دعوٰی ثابت کرنے کے لئے ساتھ ہی دلائل دیں گے۔ جس پر اس کو بار بار کہا گیا کہ یہ بات پہلے ہی سے طے شُدہ ہے کہ پہلے وہابیوں نے اپنا دعوٰی ثابت کرنا ہے اگر وُہ نہ کر سکے تو پھر اس کے بعد اہل سنت اپنا مؤقف ثابت کریں گے۔

بالآخر آغاز ہوا تو وہابی مناظر اوّل تا آخر تقریباً اپنی دو گھنٹے کی گفتگو میں اپنے دعوٰی کے مُطابِق ایک بھی دلیل نہ پڑھ سکا، پڑھنا تو کُجا وہ حدیث کی کسی کتاب کو کھول بھی نہ سکا (جس پر ویڈیو گواہ ہے) مکمّل گفتگو میں موضوع سے فرار، شرائط کا عملی انکار اور دلائل دینے سے اُسے آتی

تھی عار، کیونکہ وہ ذہنی طَور پر تھا بیمار، اور در حقیقت لاچار۔

اِدھر اُدھر کی باتیں، بے جا طعن و تشنیع، افتراء و بہتان اور الزام و استہزاء کے علاوہ کچھ بھی نہ کر سکا بلکہ خود اپنی زبان سے کہہ دیا کہ میں دلائل کسی دوسرے مناظرے میں دُوں گا، آج نہیں۔

بار بار قاری صاحب کو کہتا کہ آپ دلائل دیں انہوں نے ہر بار اس کو ان کا دعوٰی دکھایا اور بتایا کہ تمہارا مجھے کہنا کہ دلائل دو، دلائل دو غلط واویلا ہے۔ اگر تم ثابت نہیں کر سکتے تو لکھ دو یا بیان کر دو کہ میں ثابت نہیں کر سکتا آپ ثابت کریں تو مَیں دلائل پڑھتا اور ثابت کرتا ہوں' یہی لکھا ہوا ہے اور ہم اسی کے پابند ہیں' لیکن وہابی مناظر یہی کہتا رہا کہ آج میری پہلی اور آخری و حتمی دلیل یہی ہے کہ تمہاری عورتوں نے ہمارے مسلک پر عمل کر رکھا ہے وُہ سینہ پر ہاتھ باندھتی ہیں اور شرح صحیح مُسلِم میں لکھا ہوا ہے کہ فُقہاء احناف نے دونوں طرح کی روایات پر عمل کیا ہے کہ سینہ والی روایت پر عورتیں عمل کریں اور ناف والی پر مرد۔

قاری صاحب نے کہا کہ دعوٰی میں شرح صحیح مسلم یا کسی اور کتاب کو دلیل کے طَور پر پیش کرنا نہیں لکھا ہوا بلکہ تمہارا دعوٰی ہے قُرآن اور صحیح، صریح اور مرفوع حدیث۔ اپنے دعوٰی کے مطابق دلیل پیش کرو! جب وہابی شاطر اپنی اسی بات پر اڑا رہا تو مناظرِ اہلِ سُنّت نے کہا کہ چلو اسی کتاب سے ہی سینہ پر ہاتھ باندھنے والی کوئی صحیح حدیث دکھا دو' حالانکہ اس میں بھی سینہ پر ہاتھ باندھنے والی تمام روایات کو سنداً ضعیف لکھا ہوا ہے۔ مگر وہ بے چارہ کیا پڑھتا اور کہاں سے پڑھتا اُسے پتہ تھا کہ آج دانے ختم ہو چکے ہیں اور انہوں نے اندرونِ خانہ کیا چُھپا رکھا ہے مگر قُدرت نے اس کی زبان سے ہی نکلوا دیا کہ اگر مَیں روایت پڑھوں گا تو آپ اس پر اعتراض کریں گے کہ اس میں فُلاں راوی ہے سماک بن حرب ہے اس پر یہ اعتراض ہے وہ اعتراض ہے گویا کہ اس کو دن میں تارے نظر آ رہے تھے۔

پھر کہنے لگا کہ تم پڑھو عورتوں کے سینہ پر ہاتھ باندھنے والی روایت' اگر پڑھو گے تو تین ہزار اِنعام۔ قاری صاحب نے کہا کہ نہ تو یہ موضوع ہے اور نہ ہی آج اس موضوع پر بحث ہے' جب یہ موضوع ہو گا اور اس پر بحث ہو گی تو اس پر بھی میں تمہارا گھر پُورا کر دُوں گا' جو موضوع لکھ کر دیا ہے پہلے اس پر بات کرو۔

عُمر صدّیق! تم تین ہزار کی بات کرتے ہو، اگر تم آج قُرآن کی کوئی آیت یا ایک صحیح، صریح، مرفوع حدیث اپنے دعوٰی کے مطابق پڑھ دو تو میں تمہیں ایک لاکھ اِنعام دیتا ہوں۔ لیکن وہابی مناظر عُمر صدیق آخر تک اپنے موضوع کی طرف نہ آیا اور جو دعوٰی لکھا تھا اس کو ثابت نہ کر سکا۔ صرف شرح صحیح مسلم کا حوالہ دیتا اور کہتا کہ فریقِ مُخالِف کے گھر کا حوالہ دینا رسُولُ اللہ ﷺ کی سنت ہے، جس کے جواب میں مناظرِ اہلِ سنت نے بھی اس کے گھر سے دو حوالے دے کر جوابی کاروائی کر دی اور کہا کہ یہ دیکھو! تمہاری شیخ الکل فی الکل نذیر حسین دہلوی نے دوٹوک لکھ دیا ہے کہ: اور زیر ناف ہاتھ باندھنا ایسا ہوا کہ خیریوں بھی جائز ہے، اور چنداں جائے اعتراض نہیں، اس لئے کہ کچھ سند اس کی بھی ہے۔ (فتاوی نذیریہ ۱/ ۴۲۵ مکتبہ المعارف الاسلامیہ گوجرانوالہ)

اور یہ تمہارے شیخ الحدیث محمد اسماعیل سلفی نے لکھا ہے کہ: ''ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا (احناف) جہاں تک میرا ناقص مُطالعہ ہے نماز تینوں طرح ہو جاتی ہے۔۔۔ احناف کے اس عمل کو کسی نے خُود ساختہ کہا ہو میرے علم میں نہیں (تحریک آزادی فکر ۱۶۱ مکتبہ نذیریہ قصور)

وہابی مناظر نے ان کا حُلیہ بگاڑنے کی بڑی کوشش کی لیکن سُنّی مناظر نے کہا کہ انہوں نے واضح لکھا ہے کہ ''چنداں جائے اعتراض نہیں اس لئے کہ کچھ سند اس کی بھی ہے'' اور عُمر صدیق صاحب! آپ نے شرح صحیح مسلم کی جو بات کی ہے وہاں صاف لکھا ہے: ''خلاصہ یہ ہے کہ سینہ پر ہاتھ باندھنے والی تمام احادیث سنداً ضعیف ہیں (شرح صحیح مسلم ۱/۱۱۲۲)۔

باقی رہا عورتوں کے سینہ پر ہاتھ باندھنا تو وہ الگ بات ہے جس کا موضوع سے کوئی تعلّق نہیں ہے اور اس پر دوسرے دلائل موجود ہیں جن کی بناء پر فقہاء نے یہ قول کیا ہے۔ یہ وہابیوں والی روایات نہیں ہیں لیکن وہابیو! یہ بھی یاد رکھو کہ آج ہمارے درمیان جو دلیل طے ہوئی ہے وہ فقہاء کا قول نہیں بلکہ تمہارا دعویٰ قرآن اور صحیح، صریح، مرفوع حدیث کا ہے۔ پیش کرو مگر تم قیامت تک اسے پیش نہیں کر سکتے۔

وہابی مناظر قاری صاحب کے بار بار مطالبہ کے باوجود اصل بات پر نہیں آ رہا تھا، سامعین بھی پریشان تھے اور زاہد صاحب جن کو وہابیت پر قائم رکھنے کے لئے وہابی یہ مناظرہ کر رہے تھے وُہ بھی حیران تھے کہ ایک طرف تو مجھے کہنا کہ ہمارے پاس بہت ساری صحیح حدیثیں موجود ہیں اب جب سامنا ہوا ہے تو دلیل کے طور پر ایک بھی حدیث نہیں آ رہی۔

منتظمین بھی سمجھ گئے تھے کہ وہابی مناظر صرف وقت ضائع کرنا چاہتا ہے اِس لئے اُنہوں نے مناظرہ ختم کروا دیا۔

مگر اس وقت اہل سنت و جماعت کے چہروں پر نُور اور روشنی کی برسات ہو رہی تھی چہرے **تمتما** رہے تھے جب محمد زاہد صاحب نے اشکبار آنکھوں سے یہ اعلان کیا کہ مجھ پر حق واضح ہو گیا ہے میں آج اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے ہدایت نصیب فرما دی اور حق و باطل کو میرے لئے واضح فرما دیا ہے۔

احباب نے انہیں مُبارکباد دی اور مرحبا کہا اور حضرت مناظر اسلام قبلہ ساقی صاحب نے ان کی استقامت اور جُملہ اہلِ سنت کی حفاظت اور بڑھ چڑھ کر اہلِ سنت کی تبلیغ ونشر واشاعت کی دُعا مانگی حق واضح ہو گیا اور باطل سرنگوں۔

مناظرہ کے اختتام پر محمد زاہد صاحب کا بیان بھی ریکارڈ کیا گیا تھا جو ریکارڈنگ کرنے والوں کی

غفلت کی وجہ سے ضائع ہو گیا لیکن بعد میں حافظ آباد میں جشن فتح کے سلسلے میں کئے گئے درس قرآن کے جلسہ میں جو محمد زاہد صاحب اور وہابی ثناء اللہ کے علاقہ میں ہی کروایا گیا تھا۔ زاہد صاحب کو مناظر اہل سنت قاری محمد ارشد مسعود اشرف چشتی صاحب نے عمامہ عنائت فرمایا اور ان کے لئے ثابت قدمی کی دعا فرمائی' مناظرہ کی وڈیو سی ڈیز ریکارڈنگ الفاروق سی ڈی سنٹر شاہ پور کھیالی گوجرانوالہ سے دستیاب ہیں۔

صاحبزادہ محمد قاسم مجددی

فرامین قرآن کریم ارشادات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

اقوال بزرگان دین پر مشتمل ناقابل تردید دلائل کا بہترین مجموعہ

براہینِ صادق

علماء خطباء اور عاشقانِ رسول کے لئے ایمان افروز تحفہ

علمی و تحقیقی مسائل کا قیمتی خزانہ

از افادات مبارکہ:

پاسبانِ مسلکِ رضا خلیفہ مجاز مفتی اعظم عالمِ اسلام نائب محدث اعظم پاکستان

عالم باعمل حضرت علامہ الحاج پیر مفتی **ابو داؤد محمد صادق** قادری رضوی

امیر جماعت رضائے مصطفےٰ پاکستان گوجرانوالہ۔

صفحات: ۵۹۲ ہدیہ ۳۰۰ روپے

دین سے غافل اور بے عمل لوگوں کے لئے پیغامِ صادق

مُسمّٰی بہ

دعوتِ عمل

اسلامی معلومات کا خزانہ، روزمرہ کے مسائل پر مشتمل

انسانی زندگی میں محمدی انقلاب برپا کرنے والی بہترین کتاب

از افادات مبارکہ:

پاسبانِ مسلکِ رضا خلیفہ مجاز مفتی اعظم عالمِ اسلام نائب محدث اعظم پاکستان

عالم باعمل حضرت علامہ الحاج پیر مفتی **ابو داؤد محمد صادق** قادری رضوی

امیر جماعت رضائے مصطفےٰ پاکستان گوجرانوالہ۔

صفحات: ۲۳۲ ہدیہ ۱۵۰ روپے

بسم اللہ الرحمن الرحیم الصلوۃ والسلام علیک یا رسول اللہ